# معارف

اگست ۲۰۱۷ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

# سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰ روپئے۔ فی شمارہ ۲۵ روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴ روپئے
دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰ روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰ روپئے
ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰ روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

**HAFIZ SAJJAD ELAHI**
196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN
LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN
Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

**DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH**

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

**Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org**
**Website: www.shibliacademy.org**
**Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh**
**Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100**
**✆ (Office Mobile) 09170060782**

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

# معارف

جلد نمبر ۲۰۰ ماہ ذی قعدہ ۱۴۳۸ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۱۷ء عدد ۲



دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

# شذرات

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی علامہ شبلی کی عظیم الشان یادگار اور برصغیر کی ملت اسلامیہ کا قابل فخر ورثہ ہے۔ دورِ زوال میں اس کی خدمات مسلمانوں کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسے عصر حاضر کا بیت الحکمت کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا لیکن دونوں میں ایک بڑا فرق ہے۔ بیت الحکمت مسلمانوں کے دورِ عروج میں قائم ہوا تھا جب ان کے سامنے پوری دنیا سرنگوں تھی اور اس کے لیے عظیم عباسی خلافت کے بے پایاں وسائل دستیاب تھے۔ دارالمصنّفین کی تاسیس دورِ زوال کے ایک روشن دماغ کا کارنامہ ہے جب حوصلے پست اور وسائل ناپید تھے۔ اس کے بوریہ نشین خدمت گاروں کے پاس علم و فضل کے زادراہ اور قناعت کی لازوال دولت کے علاوہ کوئی اور اثاثہ نہیں تھا۔ یہ عجیب سانحہ ہے کہ اس عظیم ادارہ کے پاس ضرورت کے مطابق وسائل کبھی بھی نہیں رہے۔ البتہ آزادی سے پہلے حیدرآباد اور بھوپال کی سرپرستی سے ضروری کاموں کی تکمیل کے لیے اسباب مہیا ہوجاتے تھے اور صبر و قناعت کے ساتھ گذر بسر کی صورت بن جاتی تھی۔ بات اس سے آگے شاید ہی کبھی بڑھی ہو۔ یہاں کے مایہ ناز محققین اور مصنّفین علم و فضل کے جس مرتبہ پر فائز تھے اگر وہ کہیں اور ہوتے تو نہیں کیا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ معمار دارالمصنّفین مولانا سید سلیمان ندویؒ یہاں آنے سے پہلے پونہ کالج جیسے باوقار ادارہ میں برسرکار تھے لیکن فرض کی پکار پر اس سے کنارہ کشی میں انہوں نے ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا۔ ان حضرات کی زندگیاں قربانی اور عزیمت کی ایسی مثال پیش کرتی ہیں جو عدیم النظیر ہے۔

---

آزادی کے بعد جب دونوں ریاستوں کے وظیفے بند ہوگئے تو فطری طور پر ادارہ کی مشکلات میں بہت اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۵۲ء میں اکیڈمی کی تاریخ میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب یہ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ خدانخواستہ کہیں اکیڈمی کی بساط ہی نہ سمٹ جائے۔ اس مشکل وقت میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی توجہ اور دلچسپی سے حکومت ہند نے اکیڈمی کے لیے ساٹھ ہزار روپیہ کی گرانٹ منظور کی اور اس طرح کم از کم وقتی طور پر یہ خطرہ ٹل گیا۔ اس وقت مولانا آزاد نے اکیڈمی کے لیے ریکرنگ گرانٹ کی تجویز پیش کی تھی جسے کسی وجہ سے اکیڈمی کی نتظامیہ نے منظور نہیں کیا۔ اس وقت اکیڈمی کے معاملات کو درست کرنے میں اس گرانٹ سے بہت مدد ملی۔ لیکن یہ مسئلہ کا کوئی مستقل حل نہیں تھا۔ ۱۹۷۶ء میں پاکستان بک فاؤنڈیشن نے اکیڈمی کی ۱۱۵ کتابوں کا حقِ اشاعت پندرہ لاکھ روپیہ میں حاصل کرلیا۔ اس رقم کی ادائیگی دو قسطوں میں

ہوئی۔اس دوران ڈالر کی قیمت میں گراوٹ کے باعث بالفعل اکیڈمی کو جو رقم حاصل ہوئی وہ چودہ لاکھ سے کم تھی۔ اس وقت کی انتظامیہ نے نہایت دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس رقم سے حصص خرید لیے۔اس وقت عملاً اکیڈمی کی آمدنی کا یہی ایک مستقل ذریعہ ہے۔

---

گذشتہ نو سال کے دوران جب سے دارالمصنّفین کی تعمیرِ نو کی مہم کا آغاز کیا گیا ہے جو حالات پیش آئے اور یہ مہم جن مراحل سے گذری اس کی تفصیل ان صفحات میں پیش کی جاتی رہی ہے۔تمام تر مشکلات اور دشواریوں کے باوجود جو کئی بار ہمت شکنی کی حدود میں داخل ہو جاتی ہیں، محض اللہ کے بے پایاں فضل و کرم سے اکیڈمی کی تعمیر و ترقی کے مختلف محاذوں پر جو پیش رفت ممکن ہو سکی ہے آپ اس سے واقف ہیں۔ پوری صورت حال کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بھی کیوں کر ممکن ہوا۔ بلاشبہہ یہ کامیابیاں فضل ایزدی کی کارسازی کا نتیجہ ہیں جس کی رحمت سیرتِ رسول پاک ﷺ کے اس خدمت گذار ادارہ پر ہمیشہ سایہ فگن رہی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا یقین کامل ہے کہ یہ ادارہ قائم و دائم رہے گا اور اس کی فیض رسانیوں کا سلسلہ ایسے ہی جاری رہے گا اور وہ ان اعلیٰ مقاصد کی تکمیل و توسیع میں سرگرم رہے گا جن کے لیے اس کے عظیم موسس نے اسے قائم کیا تھا۔

---

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ پہلے بھی اس طرح کے اداروں کو کامیابی اور خوش اسلوبی سے چلانا آسان نہیں تھا۔ملک میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں ان دشواریوں میں مزید اضافہ کا سخت اندیشہ ہے۔حالات کی رفتار اور رخ سے صاف ظاہر ہے کہ آنے والے وقت میں اس طرح کے اداروں کے لیے مشکلات بڑھیں گی۔اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ برِصغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کے اختتام کے بعد جتنے بھی بڑے ملی کام انجام پائے ہیں وہ عوامی چندے ہی سے انجام پائے ہیں۔اس کے باوجود اکیڈمی نے عام طور پر سخت مجبوری کی حالت ہی میں اس راستہ کو اختیار کیا ہے۔کتابوں کی فروخت ماضی میں ادارہ کی آمدنی کا اہم ذریعہ رہی ہے۔لیکن وقت اور حالات نے اس ذریعہ کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کی اردو سے واقفیت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔اس کے علاوہ اس زمانہ میں دستیاب سمعی اور بصری وسائل نے مطالعہ کی عادت اور ذوق کو بری طرح متاثر کیا ہے اور اب کم ہی لوگوں کے پاس کتاب بینی کے لیے وقت ہے۔مزید براں کئی ناشر نہایت بے باکی سے اکیڈمی کی مقبول عام کتابوں کے مسروقہ ایڈیشن چھاپ رہے ہیں اور منافع خوری کی لالچ میں تمام اخلاقی اقدار اور حدود کو یکسر فراموش کر چکے ہیں۔اس ناجائز آمدنی سے ان کی تجوریاں تو ضرور بھر رہی ہیں لیکن اس سے اس ملی ادارہ کا جو نقصان ہو رہا ہے اور اس کو چلانے میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

---

گذشتہ چند برسوں میں اکیڈمی کے بہی خواہوں کے تعاون سے اس کی تعمیر و ترقی کے لیے جو کوشش کی گئی ہے اس کے نتیجہ میں اب اس کا سالانہ بجٹ پندرہ لاکھ سے بڑھ کر ۵۰ - ۶۰ لاکھ ہوگیا ہے۔ لیکن دارالمصنّفین جیسے ادارہ کو ایک متحرک اور فعّال ادارہ کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے یہ بجٹ ناکافی ہے اور اس میں معتدبہ اضافہ کی ضرورت ہے۔ اتنی تگ ودو اور بہت کچھ اضافہ کے باوجود ابھی تک عملہ کی تنخواہوں کو اس حد تک نہیں لایا جاسکا ہے جو ان کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کرسکے۔ کتابوں کی طباعت سے لے کر کتنے ہی کام ہیں جو وسائل کی قلت کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ جب تک اس کے وسائل میں قابل لحاظ حد تک اضافہ نہ ہوجائے بعض نہایت ضروری کاموں کی شروعات نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ضروری حد تک وسائل کی فراہمی کا مسئلہ اب غیر معمولی اہمیت اختیار کرچکا ہے اور اب اس کام کو مزید موخر نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے مسائل کا ایک کوہ گراں ہے لیکن ایک زندہ قوم کی حیثیت سے اسے ان کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش بھی کرنی ہے۔ وطن عزیز میں باعزت زندگی گذارنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ مسائل سے آنکھیں چرانے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ پوری جرأت سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دارالمصنّفین اور اس طرح کے دوسرے ملی اداروں کی بقا کو یقینی بنانے کے لیے اب نئی سوچ کی ضرورت ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں وقت کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق اس کے دائرہ کار کو وسعت دینے کی ضرورت اب شدت اختیار کرچکی ہے۔ اب صرف یہ کافی نہیں ہے کہ دارالمصنّفین زندہ رہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کے تعلق سے وہ اسی طرح اپنا کردار ادا کرے جس طرح اس نے ماضی میں کیا ہے۔ یہ امر یقینی بنانے کے لیے کہ یہ ادارہ ایک زندہ، توانا اور فعّال ادارہ کی حیثیت سے قومی اور ملی زندگی میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرتا رہے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اس کو روزانہ کی مالی پریشانیوں سے نجات دلائی جائے اور اس سلسلہ میں اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا مناسب انتظام کیا جائے تاکہ اس کے منصوبے التوا کا شکار نہ ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب اس کے لیے مناسب مالیت کا کارپس فنڈ (Corpus Fund) قائم کردیا جائے جس کی آمدنی سے وہ اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ یہ ایک بڑا کام ہے لیکن ناممکن نہیں۔ دارالمصنّفین نے ملک وقوم کی جو خدمت کی ہے کوئی اور ادارہ اس میں اس کا شریک و سہیم نہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان عدیم النظیر خدمات کے اعتراف کے طور پر اس کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کا سامان کیا جائے اور اکیڈمی کے بہی خواہ اور شبلی کے قدرداں اس سلسلہ میں عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند     آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

## مقالات

# اسلامی ریاست کے غیر مسلم ذمی

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

غیر مسلم رعایا کو ہم تین اقسام میں بانٹ سکتے ہیں۔ایک وہ جو کسی صلح نامے یا معاہدے کے ذریعہ سے اسلامی حکومت کے تحت آئے ہوں ان کو معاہدین کہا جاتا ہے۔

دوسرے وہ جو لڑنے کے بعد شکست کھا کر مغلوب ہوئے ہوں ان کو مفتوحین کہا جاتا ہے۔

تیسرے وہ جو جنگ اور صلح دونوں کے سوا کسی اور صورت سے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے ہوں اسلام میں تینوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں اور اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کو ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرے۔البتہ معاہدین اور مفتوحین کے احکام میں قدرے فرق ہے۔جن کو ذیل میں بیان کیا جائے گا۔

**معاہدین:** جو لوگ جنگ کے بغیر یا دوران جنگ اطاعت قبول کرنے پر راضی ہو جائیں اور حکومت اسلامی سے مخصوص شرائط طے کر لیں ان کے لیے اسلام کا قانون یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمام معاملات ان شرائط صلح کے تابع ہوں گے جو ان سے طے کی گئی ہیں ان شرائط کے خلاف کرنے کو اسلام سخت گناہ قرار دیتا ہے،خواہ وہ کسی قوم کے افراد ہوں ان شرائط سے قطعی تجاوز نہ کیا جائے گا۔اگرچہ فریقین کی اختیاری حیثیت اور طاقت وقوت میں کتنا ہی فرق آ جائے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

> ”اگر تم کسی قوم سے لڑو اور اس پر غالب آ جاؤ اور وہ قوم اپنی اور اپنی اولاد کی جان بچانے کے لیے تم کو خراج دینا منظور کرے (ایک دوسری روایت میں ہے کہ تم سے صلح نامہ طے کر لے) تو پھر بعد میں اس مقررہ خراج سے کچھ بھی زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لیے ناجائز ہوگا“۔

---

شعبہ دینیات (سنی)،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ۔ zafardarik85@gmail.com

دوسری روایت میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| الا من ظلم معاھداً او انتقصه او کلفه فوق طاقته او اخذ منه شیأً بغیر طیب نفس فانا حجیجه یوم القیامة ۔(۲) | خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے یا اس پر طاقت سے زیادہ بار ڈالے یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے، اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا۔ |

مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کے الفاظ عام ہیں اور ان سے یہ قاعدہ اخذ ہوتا ہے کہ معاہد ذمیوں کے ساتھ صلح نامہ میں حد شرائط طے ہوجائیں ان میں کسی طرح کی کمی بیشی کرنا قطعی جائز نہیں ہے۔ نہ ان پر خراج بڑھایا جاسکتا ہے، نہ ان تینوں پر قبضہ کیا جاسکتا ہے، نہ ان کی عمارتیں چھینی جاسکتی ہیں نہ ان پر سخت فوجداری قانون نافذ کیے جاسکتے ہیں۔ نہ ان کے مذہب میں دخل دیا جاسکتا ہے نہ ان کی عزت وآبرو پر حملہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی ایسا فعل کیا جاسکتا ہے جو ظلم یا انتقامی یا تکلیف مالا یطاق یا اخذ بغیر طیب نفس کی حدود میں آتا ہو۔(۳)

انہی احکام کی بناء پر فقہاء نے صلحاً فتح ہونے والی قوموں کے متعلق کسی طرح کے احکام و قوانین مدون نہیں کیے ہیں البتہ یہ ضرور ملتا ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا معاملہ شرائط صلح کے مطابق ہوگا۔ اس وجہ سے امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے:

| | |
|---|---|
| یوخذ منهم ماصولحوا علیه ویوفی لهم ولا یزاد علیهم ۔(۴) | ان سے وہی لیا جائے گا جس پر ان کے ساتھ صلح ہوئی ہے ان کے حق میں صلح کی شرائط پوری کی جائیں گی اور ان پر کچھ اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ |

دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑتے رہے ہوں اور جنہوں نے اس وقت ہتھیار ڈالے ہوں جب اسلامی فوجیں ان کی بستیوں میں فاتحانہ داخل ہوچکی ہوں۔ اس قسم کے افراد جب اسلامی ریاست میں رہیں گے تو ان کو وہ حقوق عطا کیے جائیں گے جن کی تفصیلات فقہی کتابوں میں موجود ہیں۔

جب امام ان سے جزیہ قبول کرے تو ان پر ہمیشہ کے لیے عقد ذمہ قائم ہوجائے گا اور ان

کی جان و مال کی حفاظت کرنا مسلمانوں پر فرض ہوگا، کیونکہ قبول جزیہ کے ساتھ ہی عصمت نفس و مال ثابت ہو جاتی ہے۔(۵) اس کے بعد امام کو یا مسلمانوں کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ ان کی املاک پر قبضہ کریں یا انہیں غلام بنایا جائے۔(۶) اس وجہ سے امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے کہ:

فاذا اخذت منهم الجزية فلا شي لک عليهم و لا سبيل ۔(۶)

جب تم ان سے جزیہ قبول کرلو تو پھر تم کو ان پر دست درازی کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

اسی طرح عقد ذمہ قائم ہوجانے کے بعد اپنی زمینوں کے مالک وہی ہوں گے ان کی ملکیت ان کے ورثاء کو منتقل ہوگی اور ان کو اپنے املاک میں بیع ، ہبہ، رہن وغیرہ کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے۔ اسلامی حکومت کو انہیں بے دخل کرنے کا حق نہ ہوگا۔(۷) نیز جزیہ کی مقدار ان کی مالی حالت کے لحاظ سے مقرر کی جائے گی۔ جو مال دار ہیں ان سے زیادہ جو متوسط ہیں ان سے کم اور جو غریب ہیں ان سے بہت کم لیا جائے گا اور جن کے پاس ذرائع آمدنی کچھ نہیں ہیں یا جن کی کفالت کی ذمہ داری دوسروں پر ہے ان سے جزیہ معاف کردیا جائے گا۔ اگرچہ جزیہ کے لیے کوئی خاص رقم مقرر نہیں ہے، لیکن اس کی تعیین میں یہ امر مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسی رقم مقرر کی جائے جس کا ادا کرنا ان کے لیے آسان ہو۔ حضرت عمرؓ نے مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ متوسط الحال لوگوں پر آٹھ آنہ مہینہ اور غریب محنت کش لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا۔(۸) ماخذ میں لکھا ہے کہ جزیہ صرف ان لوگوں سے لیا جائے گا جو اہل قتال ہیں۔ غیر اہل قتال مثلاً بچے، عورتیں، بوڑھے، اندھے، اپاہج، عبادت گاہوں کے خادم، راہب، سنیاسی، از کار رفتہ، ایسے بیمار جن کی بیماری سال کے ایک بڑے حصہ تک دراز ہوجائے اور لونڈی غلام وغیرہ جزیہ سے مستثنیٰ ہیں۔(۹) یہ بھی لکھا ہے کہ بزور شمشیر فتح ہونے والے شہر کے معابد مسلمانوں کو قبضہ کر لینے کا حق ہے لیکن اس حق سے استفادہ نہ کرنا اور بہ طریق احسان ان کو علی حالہٖ قائم رہنے دینا اولیٰ اور افضل ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جتنے ممالک فتح ہوئے ان میں کوئی معبد نہ توڑا گیا اور نہ اس سے کسی قسم کا تعرض کیا گیا، یہ بھی ہے کہ **ترکت علی حالها و لم تهدم و لم يتعرض لها** (۱۰) ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا نہ مسمار کیا گیا اور نہ ان سے کسی قسم کا تعرض کیا گیا۔

اس مختصر وضاحت کے بعد یہ بات صاف ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا کی تین قسمیں ہیں جن میں سے دو کے احکام بیان کردیے اب غیر مسلم رعایا کی تیسری قسم رہ جاتی ہے جن میں

تینوں قسم کے اہل ذمہ شامل ہیں۔اس کے احکام بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے لفظ ''ذمہ'' کی لغوی واصطلاحی تعریف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کو امان دینے کا شرعی جواز بھی پیش کردیا جائے۔

**ذمی کی تعریف:** لفظ ذمہ ذال مکسور اور میم مفتوح مشدد سے کتب لغات میں عہد وعقد، کفالت و ضمان، امان حق وحرمت کے معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

''رجل ذمی'' اس کے معنی رجل لہ عہد اوعقد نیز اس سے اہل ذمہ، اہل عہد اور اہل عقد کے معنی مراد لیے جاتے ہیں اور ان معاہدین سے مراد یہود ونصاریٰ کے علاوہ وہ لوگ ہیں جو دارالاسلام میں قیام کرتے ہیں۔(۱۱)

ضمان وکفالت کے معنی کی تصدیق حضرت علیؓ کے اس قول سے ہوتی ہے:

**ذمتی رهنية وانابه زعيم اي ضماني وعهدي رهن في الوفاء به۔(۱۲)**

یہ لفظ امان کے لیے بھی آتا ہے یعنی معاہد کو ذمی کہا گیا ہے کیونکہ اس کی جان ومال اور دین کو امان بخشا جاتا ہے۔چنانچہ حدیث شریف میں مذکور ہے: **یسعی بذمتهم الغاهم۔(۱۳)**

لفظ ذمہ کا اطلاق حق وحرمت کے لیے بھی ہوتا ہے اور معاشرہ میں یہ اصطلاح رائج بھی ہے اسی وجہ سے بولا جاتا ہے کہ فلاں کے لیے ذمہ ہے یعنی حق ہے۔اگر ذال مفتوح مشدد کے ساتھ پڑھا جائے گا۔الذمامہ تو یہ لفظ حق کے معنی کے لیے خاص ہوجائے گا اسی طرح الذمام یہ حرمت کے معنی کے لیے خاص ہے۔(۱۴) کبھی ذمہ کا اطلاق ذات ونفس پر بھی ہوتا ہے جو دونوں ذمہ کے محل ہیں عموماً یہ الفاظ زبان زد ہیں ''في ذمته كذا و برأت ذمته من كذا'' اسی طرح لفظ ذمہ کا اطلاق اسی معنی پر ہوتا ہے جو کسی چیز کو لازم کرنے یا لازم ہونے کے لیے ہو۔اس صورت میں اس سے لفظ صلح بھی وابستہ ہوجاتا ہے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ لفظ صلح سے ہر طرح کی صلح مراد لی جاسکتی ہے چاہے وہ آپس میں مسلمان کریں یا کفار کے ساتھ ہو، یا پھر اہل ذمہ سے صلح ہوجائے۔(۱۵)

چنانچہ نتیجہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عقد ذمہ وہ عقد ہے جس کے ذریعہ سے غیر مسلم، مسلمانوں کے ذمہ یعنی ان کے عہد وپیمان میں ہمیشہ کے لیے آجاتے ہیں اور ان کو دائمی طور پر دارالاسلام میں اقامت کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔اسلامی ریاست میں سکونت پذیر ہوکر وہ اس ملک

کے باشندہ ہوجاتے ہیں اور پھر انہیں اس عہد و پیمان کے ذریعہ وہ چیز عطا ہوتی ہے جس پر جنسیت کا تعلق ہوتا ہے جو عہد حاضر میں حکومتیں اپنی رعایا کے لیے دیتی ہیں اس سے انہیں اہل وطن کے حقوق حاصل ہوتے ہیں وہ اپنے واجبات ولوازمات کا التزام کر لیتے ہیں۔(۱۶) لغوی مفہوم کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ذمہ کے اصطلاحی نکات ومفہوم پر روشنی ڈال دی جائے۔

اصطلاحی مفہوم: ذمہ اصطلاح میں اس عقد کو کہتے ہیں جس میں غیر مسلموں کے ساتھ دارالسلام میں اقامت کرنے کا صلح وسلامتی کا عہد کیا جاتا ہے وہ حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارتے ہیں، جزیہ ادا کرتے ہیں اس وجہ سے مسلمانوں کی جانب سے ان کی جانوں، عزتوں اور اموال پر دائمی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں نقد ٹیکس بھی غیر مسلم اشخاص پر عائد کیا جاتا ہے۔ مگر یہ ان لوگوں پر ہے جو ادا کرنے پر قادر ہوں اور قدرت کا اندازہ ان میں سے ہر ایک کی اقتصادی حالات کو دیکھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ٹیکس ان کی حمایت وتحفظ کے بدلے میں اور وطن اور حکومت کی جانب سے ملکی دفاع کو انجام نہ دینے کی وجہ سے ہے۔(۱۷)

یہ حقیقت ہے کہ وطن کے دفاع کی ذمہ داری اور امن وسلامتی کا قیام تمام باشندوں کے لیے مساوی ہے۔ جن کو اقامت کاملہ کا حق حاصل ہے ان کے لیے وہی ہے جو مسلمانوں کے لیے ہے اور ان پر وہی چیز ہے جو مسلمانوں پر ہے لیکن جزیہ غیر مسلم اہل وطن کے جنگ میں شامل نہ ہونے اور ان کی جانب سے دفاع کے بدلے میں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جزیہ اسی پر مقرر کیا جاتا ہے جو جنگ کی قدرت رکھتا ہو اس سے بوڑھے، بچے، عورتیں اور ضعیف جدا ہیں۔(۱۸)

فقہا کا اختلاف: اصطلاح ذمہ کی تحدید میں فقہا کا اختلاف پایا جاتا ہے اس اختلاف کو ذکر کرنا بھی ضروری ہے:

احناف: **والذمی عند الحنفیة: ھو کل کافر، ماعدا عبدالاوثان من العرب والمرتدین یقر فی دیار الاسلام آمناً علی التائید بشرط بذل الجزیة۔(۱۹)**

مالکیہ: **والذمی عندالمالکیه: مال یقربه الامام علی کافر ذکر حر مکلف قادر مخالط یصح مساؤہ لم یعتقه مسلم لاستقرارہ آمناً تعبیر الحجاز والیمن۔(۲۰)**

**شوافع:** انہوں نے عقد ذمہ اور ذمی دونوں کو الگ الگ انداز سے دیکھا ہے۔ عقد الذمۃ: هو قد غیر موقف بل هو ابدی یسری علی من عقده مع المسلمین و علی ذریاته من بعده۔ و الذمی: کل کتابی و نحوه عاقل بالغ هو ذلک مناسب للقتال قادر علی اداء الجزیة۔(۲۱)

**حنابلہ:** عقدالذمة: اقرار بعض الکفار علی کفرهم بشرط بذل الجزیة والتزام احکام الملة۔(۲۲)

یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ جزیہ غیر مسلم اقوام کے لیے اسلام پر عدم ایمان یا کفر کی سزاؤں میں سے کوئی سزا نہیں ہے جیسا کہ بعض مغربی مفکرین نے اسلام کے اس اصول پر اعتراض کیا ہے بلکہ یہ ان کی حفاظت وامان کا بدلہ ہے۔

فقہی تعریفات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل ذمہ فقہاء کے نزدیک وہ باشندے ہیں جو غیر مسلم ہیں، عاقل ہیں، آزاد ہیں، اس کے ساتھ ہتھیار اٹھانے اور قتل وقتال پر قادر ہیں جنہوں نے دارالاسلام میں زندگی گزارنے کو پسند کیا ہے اور ان کی جان وآبرو اور مال محفوظ ہیں انہیں اپنے مذاہب پر آزادانہ عمل کرنے کی اجازت ہے اور وہ اس امان کے مقابلہ میں اپنی مالی قدرت کے مطابق ایک متعین رقم دینے کا عہد کر چکے ہیں۔ ابن قیم نے بھی اس سے ملی جلی بات کہی ہے کہ ان پر جزیہ کا اطلاق ہی اس لیے ہوتا ہے کہ وہ احکام اسلام اور اس کے نظام عام کا التزام کریں۔ عقد ذمہ کی بنیاد پر وہ اسلامی ریاست کی رعایا ہیں۔(۲۳)

**ذمی سے معاہدہ کا جواز:** عقد ذمہ کی مشروعیت کتاب وسنت، عمل صحابہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

سورہ توبہ آیت نمبر ۲۹ میں مذکور ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک حد پر پہنچنے کی صورت میں کفار و مشرکین سے اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جنگ وجزیہ کی اجازت دی ہے۔ جزیہ کی ادائیگی اور اس کا مطالبہ اور اس کے لیے رضامند ہونے کے بعد ان سے قتال نہیں کیا جائے گا۔ آیت میں لفظ اعطاء سے مراد جزیہ دینے کو قبول کرنا ہے اور اس کا پابند ہونا ہے "عن ید" کے تحت اور آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے۔ "ایسے موافقت کرنے والے ہاتھ جو جزیہ دینے پر قادر ہوں اور جزیہ دینے سے رکنے والے نہ ہوں" کیونکہ

اطاعت وفرمانبرداری عقد ذمہ کے موجبات میں سے ہے۔(۲۴) یہاں ''صغار'' کی وضاحت بھی ضروری ہے۔راجح قول یہ ہے کہ وہ حکومت اسلامیہ کے حکمراں کے سامنے سرتسلیم خم کردیں۔اس کو ایسے سمجھا جاسکتا ہے کہ انسان کو اس چیز کا مکلف بنادیا جائے جس کا وہ معتقد نہیں۔یہ اس کی ذلت و رسوائی ہے کیوں کہ اب اس پر ان احکام کا نفاذ ہوگا جن پر اس کا ایمان ویقین نہیں ہے۔(۲۵)

عقد ذمہ کی مشروعیت کی دوسری دلیل حدیث سے پیش کی جائے گی۔

رسول اکرمؐ جب کسی کو لشکر کا امیر مقرر فرماتے تو خوف خدا اور بھلائی کرنے کی تاکید فرماتے، جہاد کرنے اور چوری نہ کرنے اور عہد نہ توڑنے اور مثلہ نہ کرنے اور بچوں کو نہ مارنے کی نصیحت فرماتے، ساتھ ہی یہ تاکید ہوتی کہ جب تمہارا کسی مشرک دشمن سے سامنا ہو تو اس کو تین چیزوں کی دعوت دو اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی قبول کرلیں تو اس کو قبول کرلو اور ان سے ہاتھ روک لو، انہیں اسلام کی دعوت دو، اگر وہ قبول کرلیں تو تم بھی ان سے اس چیز کو قبول کرلو اور ان سے ہاتھ روک لو، اس کو دارالکفر سے دارالمہاجرین کی جانب منتقل ہونے کی دعوت دو، اور ان کو یہ بھی بتادو کہ اگر انہوں نے تمہاری شرط قبول کی ہے تو ان کے لیے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو کہ مہاجرین کے لیے حاصل ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو کہ مہاجرین پر ہیں اگر وہ دارالکفر سے منتقل ہونے کا انکار کریں تو ان کو بتلادو کہ وہ دیہاتی مسلمانوں کے زمرے میں ہیں ان پر اللہ کا وہی حکم نافذ ہوگا جو کہ مومنین پر نافذ ہے اور ان کے لیے مال فئ اور مال غنیمت میں سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔مگر یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد کریں اور اگر وہ اسلام لانے سے انکار کریں تو ان سے جزیہ کا سوال کرو اگر وہ اس پر راضی ہوجائیں، تو تم اس چیز کو ان کی جانب سے قبول کرلو اور ان سے باز آجاؤ، اگر وہ جزیہ دینے سے بھی انکار کریں تو اللہ سے مدد مانگو اور ان سے جنگ کرو۔(۲۶)

دوسری دلیل:　　مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے کہ:

> ''حدیث میں یہ صراحت موجود ہے کہ حضورؐ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو حکم دیا کہ کفار سے قتال کرو حتی کہ وہ جزیہ دینے پر راضی ہوجائیں اگرچہ اسلام میں داخل نہ ہوں''۔(۲۷)

اسی طرح ثابت ہے کہ حضورؐ نے تیما کے یہودیوں اور ہجر کے مجوس سے اسی طرح جزیہ

وصول کیا جس طرح نجران کے نصاریٰ وغیرہ سے لیا تھا۔(۲۸)

**تیسری دلیل:** عمل صحابہؓ اور اجماع امت سے بھی ذمی کے معاہدہ کا جواز ملتا ہے۔

عقد ذمہ کی مشروعیت اور جزیہ لینے پر اجماع قائم ہو چکا ہے کہ جزیہ غیر مسلم اقوام سے وصول کیا جائے گا۔(۲۹)

**ذمی سے معاہدہ کی حکمت:** عقد ذمہ کی مشروعیت کی حکمت و مصلحت کیا ہے؟ حکمت یہ ہے کہ حربی اپنی رضامندی سے قتل وقتال چھوڑ دے۔ مسلمانوں کے ساتھ پُرامن بقائے باہم کے اصول پر زندگی گزارے۔ ممکن ہے کہ وہ اسلام کی خوبیوں، مسلمانوں کے اخلاق وکردار اور ان کے حسن معاملہ سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہو جائے، کیونکہ ایک حقیقی مسلمان اپنے چال چلن اور حسن اعمال کی وجہ سے ایک داعی ہے۔

عقد ذمہ کا مقصود تحصیل مال ہرگز نہیں جیسا کہ بعض معاندین اسلام نے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ عقد ذمہ سے مراد قوموں اور امتوں کے مابین اصلاحی پیغامات کی نشر واشاعت اور اتحاد و یکجہتی کی روایتوں کو مضبوط کرنا ہے اور توحید ورسالت جیسے بنیادی فطری عقیدے کو ان کے قلوب میں جذب کرنا ہے۔(۳۰)

بلاشبہ اسلامی حکومت میں ذمیوں کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ ان کے اموال ونفوس معاملات وعقائد گویا وہ ہر طرح سے مامون ومحفوظ ہیں اور انہیں اپنی جان، مال، آبرو، داخلی وخارجی رشتوں کی حفاظت کا بھی پورا اختیار حاصل ہے۔

چنانچہ رسول اللہؐ کے اس خط پر غور کرنے سے جو آپؐ نے اہل نجران کو بھیجا تھا(۳۱) یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے ذمیوں کے ساتھ لطف وعنایت کی حد کیا ہے۔ اہل نجران کو جو حقوق عنایت کیے گئے وہ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں یعنی مکمل حمایت زندگی، حریت دین اور ہر طرح کے ظلم وزیادتی سے تحفظ کی فراہمی۔

اس کی واضح مثال حضرت عمرؓ بن الخطاب کا وہ خط ہے جو انہوں نے اہل ایلیا کے نام جاری فرمایا تھا۔(۳۲)

**امان کی لغوی تعریف:** امام راغب اصفہانی نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے:

ضد الخوف وهو يعنی عدم توقع مكروه فی الزمن الاتی، واصل الامن طمانینة النفس وزوال الخوف، والامن والامانة والامان مصادر للفعل (آمن) ويرد الامان تارة اسماً للحالة التی يكون عليها الانسان من الطمانینة وتارة لعقد الامان او صكه ۔(۳۳)

تاج العروس میں لکھا ہے کہ واستامنه طلب منه الامان، واستامن اليه دخل فی امانه، يقال امنت الاسير اعطيته الامان فامن فهو آمن ۔(۳۴)

امان کی اصطلاحی تعریف: فقہاء کے نزدیک امان کیا ہے؟

احناف کا کہنا ہے کہ حقیقتاً امان معاہدہ کی ایک قسم ہے"۔(۳۵)

مالکیہ کے نزدیک رفع استباحة دم الحربی ورقه وماله حين قتاله او العزم عليه، مع استقراره تحت حكم الاسلام مدة ما ۔(۳۶)

شوافع کے نزدیک عقد يفيد ترك القتل والقتال مع الكفار۔(۳۷)

حنابلہ کے نزدیک فقد اقتصر تعريفهم لامان بانه ضد الخوف ۔(۳۸)

یعنی احناف کے نزدیک امان ایک قسم کی رخصت ہے۔

شوافع کی تعریف میں نفس شی شامل نہیں ہے کیوں کہ ان کا کہنا ہے کہ امان ایسا عقد ہے جو قتل وقتال کے ترک پر دال ہو یہ قول صرف امان ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ عقد ذمہ اور سارے معاہدات ایسے عقود ہیں جو ترک قتل وقتال کا فائدہ دیتے ہیں۔

مالکیہ کی تعریف امان کے معنی کے زیادہ قریب ہے۔یعنی عقد امان قتال کے وقت حربی کے خون کی حفاظت فراہم کرتا ہے اور اس کی اباحت کو ختم کر دیتا ہے یا اس کو حکومت اسلامی کے تحت باقی رکھنے کی بات کرتا ہے۔

یہ وقتی امان کا ذکر ہے۔لیکن جو امان عقد ذمہ کے ساتھ جڑا ہے اس میں دوام پایا جاتا ہے امان منعقد ہونے کے بعد تو اس کی تنفیذ ضروری ہے(۳۹) اور امان لینے والے (حربی) کو اپنے طور پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے وہ دارالاسلام میں مامون ہے، کسی کو بھی لڑائی کے ارادے سے اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔(۴۰)

**امان کا شرعی جواز:** امان کی لغوی واصطلاحی تعریف بیان کرنے کے بعد مناسب ہے کہ اب امان کا شرعی جواز پیش کر دیا جائے۔ بلاشبہ امان کا جواز قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ **و ان احد من المشرکین استجارک ۔**(التوبہ:۱)

مطلب یہ ہے کہ مشرکین میں سے کوئی امان وحمایت طلب کرے، خدا کے کلام کو سننے یا اسلام شناسی کی نیت ہو اس کو امان فراہم کیا جائے اگر وہ قرآن کو سن کر ہدایت پا گیا اور ایمان کی دولت سے شرف یاب ہو گیا تو یہ بہتر ہے ورنہ اس کو اس جگہ پہنچایا جائے جہاں وہ مامون رہے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ:

> "حضورؐ نے فرمایا مسلمانوں کا ذمہ ایک ہے اس ذمہ کی کوشش ان میں کا ایک ادنیٰ شخص بھی کر سکتا ہے تو جس نے کسی مسلمان کے ساتھ بدعہدی کی اس پر اللہ، ملائکہ اور سارے لوگوں کی لعنت ہے اور اس کے نوافل وفرائض کچھ بھی قبول نہیں کیے جائیں گے"۔(۴۱)

اس حدیث میں دلالت کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کلمہ ذمہ وارد ہوا ہے جو عہد وامان، حرمت و ضمان اور حق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث کی رو سے یہ ثابت ہے کہ امان دینا تمام مسلمانوں کا حق ہے اس بنا پر کوئی بھی مسلمان کسی انسان کو یہ ذمہ دے سکتا ہے اور امان دینے کے بعد اس شخص کا قتل کرنا حرام ہے اور امان کی تمام صورتوں کا احترام کرنا ضروری ہے چاہے وہ کسی ایک ہی کی جانب سے صادر ہوا ہو۔ **کلمۃ ادناھم** کی وضاحت میں مذکور ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے کافر کو امان دینا جائز ہے۔ چاہے مسلمان مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام کیونکہ حدیث میں **ادناھم** آیا ہے جو کہ کم سے کمتر کو شامل ہے۔(۴۲)

**ذمی کے قصاص کا مسئلہ:** یہ ایک اہم پہلو ہے کیوں کہ اسلامی ریاست میں شہریوں کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ انہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام ایک ذمی اور ایک مسلمان میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا ہے۔ وہ قانون ہاتھ میں لینے کی سزا جس طرح اور جتنی ایک ذمی کو دیتا ہے اتنی ہی ایک مسلمان کو بھی دیتا ہے۔ وہ فاتح قوم کا جداگانہ تشخص اور امتیاز بالکل تسلیم نہیں کرتا۔ اس نے یہ اصول دنیا کے سامنے اس وقت رکھا جب دنیا میں کوئی حکومت بھی اپنے مفتوحوں اور

محکموں کے ساتھ یہ برتاؤ کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اسلام نے قتل کی سزا قصاص رکھی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَ لاَ تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلاَّ | اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام قرار دیا |
| بِالحَقِّ وَمَن قُتِلَ مَظْلُوماً فَقَدْ جَعَلْنَا | ہے۔ مگر یہ کہ حق کا تقاضا ہو جس شخص کا مظلومانہ قتل |
| لِوَلِيِّهِ سُلْطَاناً فَلاَ یُسْرِف فِّیْ الْقَتْلِ | ہو ہم نے اس کے ولی کو قصاص کا حق دیا ہے۔ پس |
| إِنَّهُ كَانَ مَنْصُوراً۔ (بنی اسرائیل:۳۳) | وہ قتل میں حد سے آگے نہ بڑھے اس کی مدد ہوگی۔ |

اسی طرح قرآن نے دوسری جگہ قصاص کا حکم اور اس کی علت وحکمت بھی بیان کی ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے:

| | |
|---|---|
| یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ | اے ایمان والو! مقتولین کے سلسلہ میں تم پر قصاص |
| الْقِصَاصُ فِیْ الْقَتْلَی۔ | فرض کردیا گیا ہے، اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص |
| (البقرہ:۱۷۸۔۱۷۹) | میں بڑی زندگی ہے تاکہ تم اس طرح قتل سے بچتے رہو۔ |

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں وضاحت کی گئی کہ:

**یوجب القتل المسلم بالذمی اذ لم یفرق شی منھا بین المسلم والذمی قوله تعالیٰ (کتب علیکم القصاص) عام فی الکل ولیس فی الآیة فرق بین المسلم والکافر وجب اجراء حکمھا علیھما ویدل علیه قومه عزوجل ومن قتل مظلوماً فقد جلعنا لولیه سلطاناً۔(۴۳)**

مقتول ذمی کے بدلے میں قاتل مسلمان کا قتل واجب ہے کیوں کہ عام حقوق میں ایک ذمی اور مسلمان کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور قصاص کے واجب ہونے کا حکم سب کو عام ہے۔

اس آیت کریمہ کی رو سے (عام معاملات میں) ایک کافر اور مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ قصاص کا حکم دونوں پر جاری ہوگا اور اس پر خدا تعالیٰ کا یہ قول دلیل ہے کہ ''جو مظلوم قتل ہوا ہم نے اس کے ولی کو دعوے کا حق دیا ہے''۔

قصاص کی اہمیت قرآن کی اس آیت سے بھی واضح ہوتی ہے۔ سورہ المائدہ میں ہے:

| | |
|---|---|
| وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ | اور لکھ دیا یہ ان پر اس کتاب میں کہ جی کے بدلے |
| وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالأَنفَ بِالأَنفِ وَالأُذُنَ | جی اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے |

| | |
|---|---|
| بِالأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ۔(المائدہ:۴۵) | ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلہ ان کے برابر ہے پھر جس نے معاف کردیا تو وہ گناہ سے پاک ہوگیا۔ |

اسلام میں ہر فرد کی جان محترم ہے۔اس سلسلہ میں احادیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں:

''جو کسی معاہد کو قتل کرے وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس برس کی مسافت تک موجود ہوگی''۔(۴۴)

اسی طرح ایک اور روایت میں ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| من قتل معاهداً فی غیر کنهه حرم الله علیه الجنة۔(۴۵) | جو شخص کسی معاہد کو بے بنیاد قتل کرے اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کردے گا۔ |

مذکورہ تفصیلات میں مطلق قصاص کا ذکر ہے۔البتہ حضرت علیؓ کا ایک قول منقول ہے۔ لایقتل مسلم بکافر (۴۶)(مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا)ابوداؤد میں یہ روایت اس طرح آئی ہے:

| | |
|---|---|
| لا یقتل مومن بکافرٍ و لا ذو عهدٍ فی عهده۔(۴۷) | مومن کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے اور نہ کسی معاہد کو جب تک اس سے معاہدہ ہے۔ |

محدثین نے لکھا ہے:

''اس میں واضح ہے کہ مسلمان کسی بھی کافر کو قتل کردے تو اس کے بدلے میں اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔چاہے مقتول ذمی ہو یا اس کا تعلق معاہد قوم سے ہو یا وہ دارالحرب سے امان لے کر آیا ہو یا اور کوئی ہو''۔(۴۸)

روایت کے مختلف ہونے کی وجہ سے فقہاء میں اختلاف ہے۔امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔(۴۹)ان حضرات نے مذکورہ احادیث سے استدلال کیا ہے۔امام مالک نے اس مسئلہ کو قدرے فرق سے بیان کیا ہے کہ ذمی کو مسلمان قتل کرے تو قصاص میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔البتہ اگر وہ دھوکہ اور فریب سے اسے قتل کرتا ہے تو اسے بھی قتل کردیا جائے۔(۵۰)

احناف کا مسلک یہ ہے کہ مسلمان سے ذمی کا قصاص لیا جائے گا۔ اگر وہ اسے قتل کردے تو اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی یہی مسلک تھا۔(۵۱) احناف نے دلیل میں سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۴۵ سے استدلال کیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سے ذمی کا قصاص لیا جائے گا۔ اگرچہ وہ روایات سنداً زیادہ پائیدار نہیں ہیں۔ دارقطنی میں ایک روایت ہے کہ رسولؐ نے ایک ذمی کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا اور فرمایا:

انی اکرم من وفی بذمته (۵۲) میں ان لوگوں میں سب سے زیادہ شریف ہوں جنہوں نے اپنا عہد و پیمان پورا کیا۔

اسی طرح مصنف عبدالرزاق کی روایت ہے کہ حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے اہل حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو قصاص میں اسے بھی قتل کر دیا گیا۔(۵۳) یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے لکھا کہ قاتل کو مقتول کے اولیاء کے حوالہ کر دیا جائے چاہے وہ اسے قتل کریں یا معاف کر دیں۔ چنانچہ اسے مقتول کے ولی کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے قاتل کو قتل کر دیا۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے یہ بھی لکھا کہ اگر وہ قتل نہیں ہوا ہے تو اسے قتل مت کرو۔ میمون بن مہران کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ایک تحریر دیکھی جو حیرہ کے گورنر کے نام تھی۔ اس کا تعلق اس معاملہ سے تھا کہ ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی تحریر میں لکھا کہ قاتل کو تم مقتول کے اولیاء کے حوالہ کر دو۔ وہ چاہے اسے قتل کر دیں یا معاف کر دیں۔(۵۴) اس طرح ایک اور مثال حضرت علیؓ کی ہے کہ آپ کے سامنے ایک مسلمان کو پیش کیا گیا جس نے ایک ذمی کو قتل کیا تھا۔ جب قتل ثابت ہو گیا تو آپ نے قاتل سے قصاص کا حکم دیا۔ اسی اثناء مقتول کا بھائی حاضر ہوا، اس نے عرض کیا کہ آپ اسے معاف کر دیں۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ شاید ان لوگوں نے تمہیں ڈرایا دھمکایا ہے اس نے کہا نہیں اس کے قتل کرنے سے میرا بھائی تو نہیں مل جائے گا پھر یہ کہ انہوں نے مجھے اس کا معاوضہ بھی پیش کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تم خود اپنے معاملہ کو سمجھ سکتے ہو۔ اس کے بعد فرمایا:

من کان له ذمتنا فدمه کدمنا ودیته کدیتنا۔(۵۵) جسے ہمارا ذمہ ہے اس کا خون ہمارے خون کے برابر ہے اور اس کی دیت ہماری دیت کے برابر ہے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلامی ریاست میں اگر کوئی مسلم غیر مسلم کو قتل کر ڈالتا ہے تو اس کے بدلے اسے بھی قتل کیا جائے گا اگرچہ اس کے متعلق دونوں طرح کے دلائل ہیں۔ اسلامی ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ذمی اور مسلم دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔

یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اسلام نے قتل کی سزا قتل رکھی ہے اگر مقتول کے ورثاء بغیر کسی جبر و اکراہ کے خون بہا دیت لینے پر راضی ہوجائیں تو اس کی اسلام نے اجازت دی ہے اور یہ اجازت بہت سی مصلحتوں کو سمیٹے ہوئے ہے، اس سلسلے میں اسلام مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں کرتا۔

> ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ کافروں اور مسلمانوں کی دیت کی مساوات اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کسی کو غلطی سے قتل کر دیا تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا اور اس کے ورثاء کو دیت دینا ہے اور اگر تم میں اور کافروں میں کوئی عہد ہو تو مقتول کے ورثاء کو پوری دیت دی جائے گی۔(۵۶)

ابوبکر جصاص نے دیت کی حقیقت بیان کرنے کے بعد فرمایا:

> اور دیت ایک مقدار معلوم کا نام ہے جو ایک نفس حر کا بدل ہے۔اس لیے اسلام سے پہلے بھی دیت کا رواج تھا اور اسلام نے بھی ضروری اصلاحات کے ساتھ اس رواج کو قائم رکھا۔اللہ نے جہاں مسلمان کی دیت کا ذکر فرمایا ہے وہیں عطف کر کے معاہد اور ذمی کی دیت بھی وہی قرار دی ہے جو مسلمان کی ہے۔یہ دیت ایک بدیہی چیز تھی کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو دیت کا لفظ استعمال نہ ہوتا اس لیے کہ دیت تو ایک مقدار معلوم کا نام ہے کسی جان کے بدلے میں۔اس میں کمی زیادتی نہیں ہوسکتی اور لوگ مقادیر دیات سے پہلے ہی واقف تھے۔مگر مسلم و کافر کی دیت کے فرق سے ناواقف تھے۔پس واجب ہے کہ کافر کی دیت بھی وہی ہو جو مسلمان کی ہے۔(۵۷)

امام شافعی کے یہاں ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کی تہائی ہے انہوں نے اپنے استدلال میں حضرت عبادہ بن صامتؓ کی یہ روایت بیان کی ہے۔حضورؐ نے فرمایا یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم ہے۔(۵۸)

امام احمد اور بعض دوسرے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ ذمی کی دیت نصف ہے انہوں نے

درج ذیل حدیث سے استدلال کیا ہے:

عقل الکافر نصف عقل المومن۔(۵۹) کافر کی دیت مومن کی دیت کے نصف ہے۔

احناف کے نزدیک مسلم اور ذمی کی دیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔دونوں کی دیت برابر ہے۔

دیة الکافر مثل دیة المسلم الیھودی و النصرانی و المجوسی و المعاھدو الذمی سواء۔(۶۰) کافر کی دیت مسلمان کی دیت کی طرح ہے یعنی یہودی، نصرانی، مجوسی معاہد اور ذمی کی دیت وہی ہے جو مسلمان کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ عمرو بن امیہ ضمریؓ نے دو افراد کو جن کے نام عامر تھے قتل کر دیا۔ان افراد کا رسولؐ سے معاہدہ تھا۔ چنانچہ ان کی وہی دیت ادا کی جو مسلمان کی دیت تھی۔(۶۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے ایک ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ادا کی۔(۶۲) مصنف عبدالرزاق کی روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلم اور ذمی کی دیت برابر ہے۔

اہل کفر میں سے ہر معاہد کی دیت مسلمان کی دیت جیسی ہے۔رسولؐ کے زمانہ میں یہ سنت رہی ہے۔(۶۳)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بھی رائے یہی ہے کہ ذمی اور مسلم کی دیت میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔(۶۴)

یہ رائے بھی ملتی ہے کہ اگر ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے کم ہے تو اس میں اضافہ کر کے مسلمان کی دیت کے برابر کیا جا سکتا ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو عمداً قتل کر دیا حضرت عثمانؓ نے اس سے قصاص تو نہیں لیا البتہ دیت میں اضافہ کر کے مسلمان کی دیت کے برابر اس پر دیت لازم کر دی۔(۶۵) دوسری بت پرست قوموں کے متعلق دیت میں کہا گیا:

دیة المجوس ثمان ماة درھم۔(۶۶) مجوس کی دیت آٹھ سو درہم ہے۔

شوافعؒ، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس حکم میں دوسری بت پرست قومیں بھی شامل ہیں۔(۶۷)

البتہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی رائے یہ ہے کہ ذمیوں میں جو اہل کتاب ہیں ان کی دیت مسلمان کی دیت کے نصف ہوگی۔ایک روایت ان سے مجوس کے متعلق بھی مروی ہے:

| | |
|---|---|
| رجل دیة المجوسی نصف دیة المسلم۔(۶۸) | انہوں نے مجوسی کی دیت بھی مسلمان کی دیت کے نصف رکھی ہے۔ |

پتہ یہ چلا کہ اسلام مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں رکھتا ہے۔

جزیہ: اسلام کے ابتدائی دور میں خراج اور جزیہ ایک دوسرے کے مترادف رہے (۶۹) ہیں البتہ جزیہ کا لفظ زمین کے مالیہ (خراج) کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔امام ابو یوسف نے "خراج روسھم" (۷۰) اور بلاذری نے "ارضا علیھا الجزیة من ارض الاعاجم" (۷۱) "عجم کی زمین پر جزیہ" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔اندازہ ہوتا ہے کہ جزیہ اور خراج مطلقاً بمعنی ٹیکس استعمال ہوتے رہے ہیں۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ جزیہ کب واجب ہوتا ہے ماٰخذ بتاتے ہیں کہ جب غیر مسلم دشمن ہتھیار ڈال دے اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا معاہدہ اسلامی اصولوں کے مطابق طے پا جائے اور وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول کی حفاظت ذمہ داری میں آنا قبول کر لے۔یہ بھی مذکور ہے کہ جزیہ کی وصولی پورا سال گزرنے کے بعد ہوگی اگر کوئی ذمی مسلمان ہوجائے تو اس کا جزیہ معاف ہوجاتا ہے۔(۷۲)

جزیہ کی حکمت و مصلحت کے متعلق ماخذ میں بہت سے نکات مذکور ہیں۔ذمی لوگ ایک طرف کفر پر مصر ہیں اور دوسری طرف وہ اپنی جان و مال کی حفاظت تو چاہتے ہیں لیکن مسلمان کے ساتھ مل کر دارالاسلام کے دفاع میں اور دارالحرب کے خلاف جہاد میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔اس لیے ان کے سامنے ایک آسان متبادل صورت رکھی گئی ہے کہ شہری حقوق کے بدلہ کے طور پر جزیہ کی مناسب مقدار انہیں ادا کرنی پڑتی ہے۔

اس میں ایک نکتہ یہ ہے کہ دارالاسلام کے باشندے اس کی حفاظت و دفاع کے لیے اپنی رغبت و خوشی سے جان و مال کی قربانی دیتے ہیں اور ایک غیر مسلم سے یہ توقع نہیں ہوتی کہ دارالسلام سے اسے قلبی لگاؤ ہو،یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانہ میں جب اسلامی فوجیں حمص (شام) سے ہٹ کر آئیں تو حضرت ابوعبیدہؓ نے وہاں کے یہودیوں اور عیسائیوں کو بلا کر کئی لاکھ جزیہ کی رقم یہ

کہہ کر واپس کردی کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لیے یہ جزیہ کی رقم بھی نہیں رکھ سکتے۔(۷۳)
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ ان شہری حقوق کے جواب میں ایک ٹیکس ہے جو جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کی شکل میں انہیں حاصل ہوئے ہیں۔ مسلم آبادی حقوق کے لیے دوسری طرح کے فرائض بجالاتی ہے یعنی فوجی خدمات، مگر غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہو کر صرف ٹیکس کے مکلف ہوتے ہیں۔

جزیہ کا وجوب: جزیہ کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے واجب قرار دیا ہے۔

| | |
|---|---|
| قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَلاَ | ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ پر ایمان نہیں |
| بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللهُ | لاتے اور آخرت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو |
| وَرَسُولُهُ وَلاَ يَدِيْنُونَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ | حرام ٹھہراتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے |
| الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا | حرام کی ہیں اور نہ سچے دین کو اختیار کرتے ہیں ان |
| الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ۔ | لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے یہاں تک |
| (سورہ توبہ:۲۹) | کہ وہ جزیہ دیں اور محکوم و مطیع ہونا قبول کریں۔ |

مذکورہ آیت میں دو نکتے مفسرین و اہل علم کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ایک ”عن ید“ اور دوسرا ”وھم صاغرون“ اس کی وضاحت اوپر آچکی ہے۔(۷۴)

وجوب جزیہ کا خلاصہ پھر سے پیش ہے:

۱۔ مسلمان جنگ کے ذریعہ انہیں قوت سے مغلوب کرلیں اور جنہیں مغلوب نہ کیا گیا ہو اور وہ قتال کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں جیسے بچے، بوڑھے اور عورتیں تو ان میں جزیہ واجب نہیں ہوگا۔
۲۔ وہ اسلامی حکومت کے مطیع و محکوم ہو کر معاملہ طے کرلیں۔ ۳۔ ذمی کی جان و مال کی حفاظت کی نعمت حاصل ہو۔ البتہ اگر جان و مال کی حفاظت حاصل نہ ہوگی تو جزیہ لینا واجب نہیں ہے۔

وجوب جزیہ کی دوسری شق یہ ہے کہ جزیہ عائد کرنے کا کیا طریقہ وضابطہ ہے۔ دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کافر مسلمانوں کی قوت سے ٹکرانے کی جرات نہ کر پائیں اور بہ رضا و رغبت غلبۂ اسلام قبول کرلیں۔ اس صورت میں جزیہ کی مقدار وہی رہے گی جو فریقین کے ذریعہ قبول کریں گے، معاہدہ اس میں اضافہ جائز نہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جنگ میں شکست کھا کر کافر غلبۂ اسلام قبول کرلیں اور امام وقت انہیں اپنے مذہب، اپنی املاک پر برقرار رہنے کی اجازت دے دے اور ان پر جزیہ عائد

کردے۔اس صورت میں فقہاء کا اختلاف ہے۔(۷۵)

حنابلہ کے نزدیک جزیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے بلکہ امام وقت کی صواب دید پر موقوف ہے۔امام مالک کے نزدیک جزیہ کی مقدار چار دینار یا چالیس درہم ہے اور امام شافعی کے نزدیک امیر وغریب سب پر ایک دینار ہے۔(۷۶)

ان کے نزدیک ہر بالغ ذمی پر جزیہ ضروری ہے خواہ مرد ہو یا عورت حتی کہ بوڑھے، اندھے اور راہب بھی جزیہ ادا کریں گے۔(۷۷)

**جزیہ کن لوگوں پر واجب نہیں:** غیر اہل جنگ یعنی عورت، بچہ، لنگڑا، لولا، اندھا، غلام، پاگل، محتاج (مسکین) اور راہب جزیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ موقف احناف کا ہے(۷۸) البتہ بعض حنفی علماء مثلاً امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر راہب لوگ غنی اور دولت مند ہوں یا گرجا کنیسہ کے ساتھ وقف املاک و اراضی ہوں تو اس پر بھی جزیہ عائد ہوگا اور اگر وہ فقر واحتیاج کا دعویٰ کرے تو اس کے مذہب کے مطابق اس سے اس بات کا حلف لیا جائے گا اور پھر اس سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔(۷۹) کیونکہ حضرت عمرؓ صرف ان لوگوں سے جزیہ وصول کرتے تھے جو استرہ استعمال کرتے تھے، من جرت علیہ الموسی (۸۰) اور عورتوں اور بچوں سے جزیہ نہیں لیتے تھے۔ یہ بھی ہے کہ جزیہ کی مقدار ایسی ہونی چاہیے کہ اہل الذمہ کی استطاعت کے بھی مطابق ہو اور مسلمانوں کے بیت المال کو بھی نقصان نہ پہنچتا ہو۔(۸۱) جزیہ کی وصولی کے سلسلہ میں سزائیں دینے سے منع کردیا گیا ہے اور نرمی سے برتاؤ کا حکم دیا گیا ہے۔(۸۲) امام محمد نے ایسے نصرانی محنت کش کو بھی جزیہ سے مستثنیٰ کیا ہے جس کے پاس اہل وعیال کے اخراجات کے بعد کچھ نہ بچتا ہو۔(۸۳)

**جزیہ صرف یہود ونصاریٰ سے لیا جائے گا:** فقہاء کا یہ دلچسپ اختلاف ہے کہ مذہب کے لحاظ سے جزیہ کی حفاظت میں آنے کے مستحق کون لوگ ہیں۔ اہل کتاب اور مجوس سے جزیہ لینے پر تو سب متفق ہیں، البتہ اختلاف ان کے سلسلہ میں ہے جو اہل کتاب نہیں ہیں مثلاً صابی، مشرکین عرب وغیرہ، احناف میں سے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک، مشرکین عرب کے سوا ہر کافر ومشرک سے جزیہ قبول کیا جاسکتا ہے خواہ مجوس ہوں یا صابی یا بت پرست۔ امام شافعی کے نزدیک جزیہ اہل کتاب ومجوس (عربی ہوں یا عجمی) سے خاص ہے۔ امام مالک کے نزدیک مرتد کے سوا ہر کافر سے جزیہ لیا جاسکتا ہے۔

امام یوسف کے نزدیک جزیہ اہل عجم کے ساتھ خاص ہے۔خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک۔(۸۴)

**عہد رسالت میں جزیہ:** رسول اکرمؐ کے عمل جزیہ کی ایک جھلک گزر چکی ہے۔آپؐ نے اہل نجران، حارث بن عبدکلال، نعیم بن عبدکلال، شریح بن عبدکلال اور بحرین کے عمان کو جزیہ یا اسلام قبول کرنے کا اختیار دیا۔اسی طرح ہجر کے مجوسیوں سے بھی آپؐ نے جزیہ قبول کیا۔البتہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ اوران کی عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا۔(۸۵) بحرین کے بعض مجوسیوں کے نام آپؐ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا:

> ''اگر تم لوگ نماز قائم کرو زکوٰۃ دو، اللہ اوراس کے رسول کی خیر خواہی کرو، کھجور کا دسواں حصہ ادا کرو، غلے کا پانچواں حصہ دو، اپنی اولاد کو مجوسی نہ بناؤ، تو اسلام لاتے وقت جو کچھ تمہارے پاس تھا وہ تمہارا ہے اور اگر تم انکار کرو تو تم پر جزیہ عائد ہوگا''۔(۸۶)

غزوۂ تبوک سے واپسی پر جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو مدینہ، خیبر، یمن اور نجران کے تمام اہل الذمہ پر جزیہ عائد کیا اوراس میں اسلحہ اور دیگر سامان ادا کرنے کی بھی اجازت دی۔(۸۷)

**خلافت راشدہ میں جزیہ:** حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جزیرہ عرب سے باہر سب سے پہلا مفتوح شہر بصریٰ تھا، آپ نے اس کے باشندوں کو جزیہ یا اسلام دونوں کا اختیار دیا اور جب وہ جزیہ دینے پر راضی ہوگئے تو بالغ مرد پر ایک دینار نقد اور ایک جریب گندم سالانہ کے حساب سے جزیہ عائد کیا۔(۸۸) خالد بن ولیدؓ نے اہل دمشق پر جزیہ عائد کیا اس کی مقدار ایک دینار نقد، ایک جریب گندم اور کچھ تیل اور سرکہ تھا البتہ ابوعبیدہؓ نے اہل شام کے کچھ لوگوں پر جزیہ کی ایک معین مقدار عائد کردی اور اس میں یہ شرط تھی کہ جزیہ دینے والے کم یا زیادہ ہوجائیں تو بھی ان میں کمی یا بیشی نہیں ہوگی۔مگر کچھ لوگوں کے ساتھ یہ شرط تھی کہ ان کی استطاعت کے مطابق جزیہ وصول کیا جائے گا۔یعنی اگر مال و دولت میں اضافہ ہوا تو جزیہ بھی بڑھ جائے گا اور اگر مال میں کمی واقع ہوئی تو اس قدر جزیہ میں کمی واقع کردی جائے گی۔(۸۹) حضرت عمرؓ کے عہد میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔شام، عراق، مصر اور ایران میں جزیہ عائد کرنے کی مقدار اور طریق کار میں اختلاف ملتا ہے۔حضرت عمرؓ نے سونا رکھنے والوں پر چار دینار، چاندی رکھنے والوں پر چالیس درہم جزیہ عائد کیا۔اوراس کے ساتھ مسلمانوں کے اخراجات اور

تین دن کی ضیافت کے اخراجات بھی شامل کیے۔(۹۰) شام کے لوگوں پر جزیہ کی مقدار سونا رکھنے والوں پر چار دینار۔ مسلمانوں کے اخراجات کے لیے فی کس ماہانہ دو مد (پیمانہ) گندم اور قسط (پیمانہ) تیل اور چاندی رکھنے والوں پر چالیس درہم اور پندرہ صاع (ایک پیمانہ) تھی، مصر والوں سے غلے کی مقدار ایک اردب (قدیم مصر کا پیمانہ غلہ تھی) اس کے علاوہ تیل اور شہد کی بھی مقدار تھی۔(۹۱) حضرت عمرؓ نے جب سعد بن عامر سے جزیہ کی تاخیر کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم اہل الذمہ کی سہولت کے پیش نظر ان کی فصلیں تیار ہونے تک انہیں مہلت دے دیا کرتے ہیں۔ آپ اتنے خوش ہوئے کہ فرمایا: ''جب تک میں زندہ ہوں تجھے معزول نہیں کروں گا''۔(۹۲)

حضرت عثمانؓ نے بھی جزیہ کی روایت کو برقرار رکھا۔ چنانچہ جب افریقہ کے بعض خطے فتح ہوئے تو آپ نے بربروں سے جزیہ قبول کرلیا اور اہل الذمہ کی حیثیت عطا کردی۔(۹۳) اسی طرح حضرت علیؓ اہل حرفہ سے ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں قبول کر لیتے تھے اور ذمیوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرتے تھے کہ وہ انہیں فروخت کر کے نقد پیسہ بطور جزیہ ادا کریں۔ حضرت علیؓ نے ایک مالدار سے ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہارا جزیہ معاف ہے لیکن تمہاری زمین پر حکومت کا حق رہے گا یعنی زمین کا خراج معاف نہیں ہوگا۔(۹۴)

واقعہ یہی ہے کہ عہد رسالت سے خلفائے راشدین تک کسی بھی طرح سے غیر مسلم رعایا پر زور وزبردستی نہیں کی گئی۔

**اموی دور میں جزیہ:** حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عبدالملک اور حجاج کی زیادتیوں کا ازالہ کرتے ہوئے اپنے عمال کو حکم جاری کیا کہ جو توحید ورسالت کا اقرار کرے ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے تو اس پر جزیہ ہرگز نہیں ہے۔(۹۵) عبدالملک بن مروان اور حجاج بن یوسف نے جہاں جزیہ میں اضافہ کیا وہاں اسلام قبول کرنے والے ذمیوں سے بھی جزیہ لینا شروع کردیا اور کہا کہ جزیہ کی حیثیت بھی غلامی کی سی ہے اور اسلام لانے سے غلامی زائل نہیں ہوتی، اس لیے جزیہ بھی معاف نہیں ہوگا۔ عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ بنتے ہی اس حکم کو منسوخ کردیا، مگر ہشام بن عبدالملک نے پھر بحال کردیا، بنوامیہ کے اس رویہ کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔(۹۶)

**عباسی دور میں:** عباسی دور میں مالیات کے نظام کی تنظیم ہوئی اور چار عظیم الشان کتابیں تصنیف

کی گئیں۔ کتاب الخراج، (ابو یوسف)، کتاب الاموال، (ابوعبید بن سلام) کتاب الخراج (یحییٰ بن آدم)، الاحکام السلطانیہ (الماوردی)۔ ان میں جزیہ و خراج پر جہاد کے ضمن میں بحث کی گئی ہے اور جزیہ و خراج کے مابین واضح طور پر فرق بیان کیا گیا ہے۔ خراج محصول زمین اور جزیہ صرف ذمی سے محصول کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ البتہ اس عہد میں جزیہ کی مقدار کم ہوگئی تھی کیوں کہ اہل الذمہ کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا تھا اور پہلے عباسی خلیفہ نے یہ اعلان کردیا تھا کہ جو ہمارا دین قبول کرے گا اور ہماری طرح نماز قائم کرے گا اس پر جزیہ نہیں ہوگا۔ (۹۷) اسی طرح خلیفہ مہدی نے اس میں یہ تبدیلی کی کہ آمدنی کی کم یا زیادہ مقدار اور افراد کی تعداد کے مطابق جزیہ وصول کرنے کا حکم دیا۔ (۹۸)

---

## حواشی

(۱) سنن ابوداؤد، کتاب الخراج والامارۃ، والفئ، باب فی تعشیر اہل الذمۃ اذا اختلفنا بالتجارات۔ (۲) ایضاً۔ (۳) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، ص:۵۷۹-۵۸۰، مطبع اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی، بار اول، ۱۹۹۱ء، بار دوم ۱۹۹۹ء۔ (۴) ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، ص:۳۵، مطبع بولاق، بدون تاریخ۔ (۵) بدائع الصنائع، ج، ۷، ص:۱۱۱۔ (۶) ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، ص:۸۲۔ (۷) ابن ہمام، محمد بن عبدالواحد، فتح القدیر، ج:۴، ص:۳۵۹، مطبع الکبری الامیرہ، مصر، ۱۳۱۵ھ۔ (۸) ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، ص:۳۶۔ (۹) ایضاً، ص:۷۳۔ (۱۰) ایضاً، ص:۸۳۔ (۱۱) زبیدی، محمد المرتضیٰ، تاج العروس من جواہر القاموس، ج:۸، ص:۳۰۱، مطبع بیروت، دار مکتبہ الحیاۃ۔ (۱۲) ایضاً۔ (۱۳) حاکم نیشاپوری، محمد بن عبداللہ بن حمدویہ، المستدرک علی الصحیحین، ج:۲، ص:۱۴۱، مطبع بیروت دار الکتاب عربی، بدون سن۔ (۱۴) ج العروس، ج:۸، ص:۳۰۱۔ (۱۵) ایضاً۔ (۱۶) قرضاوی، یوسف، غیر المسلمین فی مجتمع الاسلامی، ص:۷، مطبع بیروت موسسۃ الرسالۃ للطباعۃ، ۱۴۰۴ھ، ۱۹۸۳ء۔ (۱۷) آرنلڈ، سیر تومانس، الدعوۃ الی الاسلام، ص ۷۸-۸۰، ترجمہ عربی، مترجم، حسن ابراہیم حسن، مطبع قاہرہ، مکتبہ النہضۃ المصریۃ، ۱۹۷۱ء۔ (۱۸) ابن قیم الجوزیہ، محمد بن ابی بکر، احکام اہل الذمہ، تحقیق صبحی صالح، ج ۱، ص:۴۲-۴۴، مطبع بیروت، دار العلم للملایین، ۱۹۸۳ء۔ (۱۹) جصاص، ابوبکر احمد بن علی، احکام القرآن، ج:۳، ص:۹۱، مطبع بیروت، دار الکتاب عربی، سن اشاعت ۱۳۲۵ھ۔ (۲۰) لدردید، احمد بن محمد، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک الی مذہب امام مالک، ج ۲، ص:۳۰۸-۳۰۹، مطبع مصر، دار المعارف ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء۔ (۲۱) الشربینی، محمد الخطیب، مغنی المحتاج الی معرفۃ معانی الفاظ المنہاج، ج:۴، ۳۴۳، مطبع دار الفکر بدون سن۔ (۲۲) بہدنی، منصور بن یونس،

کشاف القناع عن متن الاقناع، ج:۳،ص:۱۱۶، مطبع بیروت، دارالفکر، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء۔(۲۳) الدرینی، فتحی، خصائص التشریع الاسلامی فی السیاسۃ والحکم ص:۲۱۶، مطبع بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔(۲۴) ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی، فتح الباری، بشرح صحیح البخاری، تحقیق محب الدین الخطیب، ج:۶،ص:۲۵۹، مطبع قاہرہ دارالریان للتراث، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۶ء۔ (۲۵) البجیری، سلیمان محمد بن عمر، حاشیۃ البجیری علی الخطیب المسماۃ بتحفۃ الحبیب علی شرح الخطیب، ج:۴، ص:۲۶۸، مطبع مصر، شرکہ مکتبہ مصطفی البابی الحلبی اولادہ، ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء۔(۲۶) الصحیح المسلم، کتاب الجہاد والسیر ، باب تاسیر الامام الامراء علی البعوث۔(۲۷) الصحیح البخاری، کتاب الجزیۃ والموادعہ، باب الجزیۃ والموادعۃ مع اہل الذمۃ والحرب۔(۲۸) شوکانی، محمد بن علی، نیل الاوطار، شرح منتقی الاخبار من احادیث سید الاخیار، ج:۸،ص: ۶۳ ـ ۶۸، مطبع بیروت، دارالفکر، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء۔(۲۹) ایضاً، ص:۶۵۔(۳۰) الشربینی، مغنی المحتاج، ج:۴،ص:۲۴۲۔(۳۱) بلاذری، احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان، ص:۷۵ـ۷۶، مطبع بیروت، دارالکتب العلمیۃ ۱۴۰۳ / ۱۹۸۳ء۔(۳۲) اللہ، ڈاکٹر، مجموعہ الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ، ص:۳۸۰، مطبع دارالارشاد بیروت، سن اشاعت ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۶۹ء۔(۳۳) اصفہانی، راغب الحسین بن محمود، المفردات فی غریب القرآن، ص:۲۵، تحقیق محمد سید گیلانی، مطبع مصر، مصطفی البابی الحلبی واولادہ، سن اشاعت، ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء۔(۳۴) تاج العروس، ج:۹،ص: ۱۲۴۔(۳۵) ابن ہمام، محمد بن عبدالاحد، کمال الدین، شرح فتح القدیر علی الہدایۃ، ج:۴،ص: ۲۹۸، مطبع بیروت داراحیاء التراث، ۱۳۱۶ھ۔(۳۶) الخطاب، محمد بن عبدالرحمن الطرابلس المغربی، مواہب الجلیل شرح مختصر خلیل، ج: ۳،ص: ۳۶۰، مطبع طرابلس، لیبیا مکتبہ نجاح، بدون سن۔(۳۷) مغنی المحتاج، ج: ۴،ص:۲۳۶۔(۳۸) کشاف القناع، ج: ۳،ص: ۱۰۴۔(۳۹) خسی، محمد بن احمد بن سہل، شرح کتاب السیر الکبیر لمحمد بن الحسن الشیبانی، ج: ا،ص: ۲۸۳، تحقیق صلاح الدین المنجد، مطبع قاہرہ ابن تیمیہ ۱۹۷۱ء۔(۴۰) خلاف، عبدالوہاب، السیاسۃ الشرعیۃ، ص:۶۹، مطبع بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ سن اشاعت ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء۔(۴۱) الصحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر ، باب اثم من عاہد ثم غدر۔ (۴۲) زرکلی، خیر الدین، الاعلام، ج:۶،ص:۳۸، مطبع بیروت دارالعلم للملایین، ۱۹۸۱ء۔ (۴۳) جصاص، احکام القرآن، ج:ا،ص: ۱۱۴۔(۴۴) الصحیح البخاری، کتاب الدیات، باب من قتل ذمیا بغیر جرم۔(۴۵) سنن ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الوفاء للمعاہد وحرمتہ ذمتہ۔(۴۶) الصحیح البخاری، کتاب الدیات، باب لا یقتل مسلم بکافر۔(۴۷) سنن ابوداؤد، کتاب الدیات، باب ایقاء المسلم بالکافر۔(۴۸) خطابی، ابوسلیمان، احمد بن محمد، معالم السنن، ج: ۴،ص:۱۷، مطبع العلمیۃ الحلب، ۱۳۵۱ھ۔ ۱۹۳۲ء۔(۴۹) عینی، بدرالدین ابومحمد محمود بن احمد، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جز:۱۹،ص:۳۴۹، مطبع البابی الحلبی مصر، ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۲ء۔(۵۰) موطا امام مالک کتاب العقول، باب ماجاء فی دیۃ اہل الذمۃ۔(۵۱) عینی، عمدۃ القاری، ج۱۹، ص۳۴۹۔(۵۲) ابن حجر، فتح الباری، ج:۱۲،ص:۲۶۲۔(۵۳) زیلعی، جمال الدین ابو محمد عبداللہ الحنفی، نصب الرایۃ فی تخریج

الاحادیث الہدایہ، ج:۴،ص:۳۳۷،مطبع دارالحدیث ، قاہرہ، بدون سن ۔ (۵۴) ایضاً۔ (۵۵) ایضاً، ذہبی، شمس الدین، مناقب امام ابی حنیفۃ وصاحبیہ، ج۱ ص ۹۴ مطبع لجنۃ احیاء المعارف حیدرآباد دکن، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۰۸ھ۔ (۵۶) قرطبی، احکام القرآن، ج:۲،ص:۲۹۰۔ (۵۷) جصاص، احمد بن علی ابوبکر الرازی، احکام القرآن، ج ۳،ص ۲۱۲، مطبع دار احیاء التراث عربی، ۱۴۰۵ھ۔ (۵۸) ابن قدامہ، ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد المقدسی، المغنی علی مختصر الحزقی تحقیق، الدکتور عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی و د، عبدالفتاح محمد الحلو ، ج:۱۲،ص:۵۵، مطبع قاہرہ، مصر سن اشاعت ۱۴۱۳ھ/ ۱۹۹۲ء۔ (۵۹) سنن نسائی، ابواب القسامہ، باب کم دیۃ الکافر۔ (۶۰) قرطبی، احکام القرآن، ج:۲،ص:۲۹۰۔ (۶۱) سنن ترمذی، ابواب الدیات، باب۔ (۶۲) دارقطنی، ابوالحسن، علی بن عمر بن احمد بن مہدی، الشافعی، السنن، کتاب الحدود والدیات وغیرہا، باب، مطبع، دہلی، سن اشاعت، ۱۳۱۰ھ۔ (۶۳) زیلعی، نصب الرایۃ، ج:۴،ص:۳۶۸۔ (۶۴) ایضاً،ص:۹۸۔ (۶۵) عبدالرزاق، ابوبکر عبدالرزاق، بن ہمام الصنعانی، المصنف ، ج:۱۰،ص:۹۶، تحقیق حبیب الرحمٰن الاعظمی، مطبع مکتب الاسعدی، بیروت ، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔ (۶۶) موطا، کتاب العقول، باب ماجاء فی دیۃ اہل الذمۃ ۔ (۶۷) ابن قدامۃ، المغنی، ج:۱۲،ص:۵۵۔ ۵۶۔ (۶۸) مصنف عبدالرزاق، ج:۱۰،ص:۹۵۔ (۶۹) ابن منظور، ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم منظور الافریقی المصری، لسان العرب، مادہ: ج ز ن، مطبع دار بیروت، ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء۔ (۷۰) کتاب الخراج، ص ۷۰، مطبع بولاق، سن اشاعت، ۱۳۰۲ھ۔ (۷۱) بلاذری، فتوح البلدان، ص:۱۵۱۔ (۷۲) جصاص، احکام القرآن، ج:۳،ص:۱۰۰۔۱۰۱۔ (۷۳) بلاذری، فتوح البلدان، ص:۱۳۷۔ (۷۴) آلوسی، شہاب الدین سید محمود، روح المعانی، ج:۱۰،ص:۷۹، مطبع قاہرہ، بدون سن۔ (۷۵) ابویوسف، کتاب الخراج، ص:۶۹۔ (۷۶) حسن حبشی، اہل الذمۃ فی الاسلام، ص:۲۳۸، مطبع دار الفکر العربی، قاہرہ، بدون سن۔ (۷۷) ابوعبید، قاسم بن سلام، کتاب الاموال، ص:۲۷۔ (۷۸) شافعی، کتاب الام، ج:۴،ص:۹۸۔ (۷۹) کتاب الخراج، ص:۶۹۔ (۸۰) ایضاً، ص:۷۰۔ (۸۱) ابوعبید، کتاب الاموال، ص:۳۷۔ (۸۲) ایضاً، ص:۴۱۔ (۸۳) ایضاً، ص: ۴۲۔ (۸۴) جصاص، احکام القرآن، ج:۳،ص:۹۶۔ (۸۵) ایضاً، ص:۲۷۔۳۱۔ (۸۶) بلاذری، فتوح البلدان، ص:۹۶۔ (۸۷) حسن حبشی، اہل الذمۃ فی الاسلام، ص:۲۲۱۔ (۸۸) بلاذری، فتوح البلدان، ص: ۱۳۴۔ (۸۹) ایضاً، ص: ۱۴۴۔ ۱۵۴۔ (۹۰) ابوعبید، کتاب الاموال، ص:۳۹۔ (۹۱) ایضاً، ص:۴۰۔ (۹۲) ایضاً، ص: ۴۴۔ (۹۳) ایضاً، ص:۳۴۔ (۹۴) جصاص، احکام القرآن، ج:۳،ص:۱۰۱۔ (۹۵) ایضاً۔ (۹۶) ایضاً، ص:۱۰۲۔ (۹۷) مہر، مولانا غلام رسول، جزیہ اور اسلام، ص:۳۹، مطبع لاہور، پاکستان، بدون تاریخ۔ (۹۸) ایضاً، ص:۴۰۔

# مایہ ناز مصلح و مرشد

## حضرت سید خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہؐ

ڈاکٹر راہیؔ فدائی

سرزمین ہند میں خصوصاً جنوب کی ریاستوں میں بارہویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) سیاست کے علاوہ مذہبی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے، اس صدی میں اصلاح معاشرہ اور تصحیح عقیدہ کی تحریک اس وسیع و عریض علاقے میں منظم طور پر چلائی گئی، درستگیٔ عقائد و رد بدعات کی اس تحریک کے بانی و قائد حضرت علامہ سید شاہ خواجہ رحمت اللہ حسینی ملقب بہ نائب رسول اللہؐ تھے۔ یہ لقب ان کے معاصر اہل علم و اصحاب ورع کا دیا ہوا ہے، جیسا کہ سلسلۂ شہ میریہ کے نامور عالم وصوفی اور بلند پایہ شاعر جامیٔ دکن حضرت سید شاہ کمال الدین بخاری معروف بہ "شاہ کمال" (متوفی ۱۲۲۴ھ) نے ان کی مدح میں جو قصیدہ تحریر فرمایا تھا، اس کے ابتدائی دو شعر اس طرح ہیں:

رحمت اللہ خواجۂ آفاق تم ہادیٔ عالم علی الاطلاق تم
خلق کو کرتے ہو دعوت سوئے حق نائب پیغمبرؐ خلاّق تم (۱)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ولادت: ۱۱۱۴ھ۔ وفات: ۱۱۷۶ھ) کے ہم عصر حضرت خواجہ رحمت اللہ (ولادت: ۱۱۰۵ھ۔ وفات: ۱۱۹۸ھ) چونکہ سنت مطہرہ پر سختی سے عامل اور اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مضبوطی سے قائم تھے اس لیے "نائب رسول اللہؐ" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ ان کے خلیفہ حضرت شاہ محمد رفیع الدین قندھاری (متوفی: ۱۲۴۱ھ) نے اپنی فارسی تالیف "ثمراتِ مکیہ" میں اور مصنف "بحرِ رحمت" حضرت ابوسعید ولاؔ (متوفی: ۱۲۶۴ھ) نے ان کے نام کے ساتھ نائب

---

بنگلور، کرناٹک۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لکھا ہے۔

بارہویں صدی ہجری پر دراصل دسویں اور گیارہویں صدی کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے، یہ دونوں صدیاں محرمات ومبتدعات اور مذہبی نفرت وتنازعات کی مرکز ومنبع بنی رہیں، انہیں ادوار میں مذہب تشیع اور رفض وتقیہ کو فروغ حاصل ہوا یہاں تک کہ سرکاری سطح پر شیعیت کو شائع کرنے کی سعی کی گئی اور بعض علاقوں میں بہ اصرار شیعیت کے رسوم ومعتقدات نافذ بھی کیے گئے، جس سے عوام تو عوام خواص بھی متاثر ہو گئے۔ دینی اعتبار سے اس مکدّر ماحول اور مسموم فضا کا سبب اس دور کے اکثر حکمران وسلاطین کا رسوم وخرافات کا شائق ہونا اور بدعقیدگی و بدکرداری میں سراپا ملوث رہنا ہے، ان تمام امور بد کے اثرات وثمرات کا غلط رسم ورواج کی صورت میں عوام کی زندگیوں میں مرتب ہونا لازمی وفطری ہے، عربی زبان کا مقولہ ہے ''الناس علی دین ملو کھم ''یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں، سنسکرت زبان میں بھی اسی مفہوم کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے ''یتھا راجا تتھا پرجا'' یعنی اخلاق وکردار اور خیالات وافکار کے اعتبار سے راجا اور راعی جس سطح کے ہوتے ہیں، عوام ورعایا بھی اسی سطح کی ہوتی ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت کے لیے بارہویں صدی ہجری کے ماقبل دور کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیں تو ہمارے دعویٰ کے لیے بین دلیل فراہم ہو جائے گی۔

سلطان محمد تغلق (متوفی: ۷۹۰ھ مطابق: ۱۳۸۸ء) کے آخری دور میں دکن کے امیر علاء الدین حسن گنگوہ (متوفی: ۷۵۹ھ م ۱۳۵۷ء) نے ۷۴۷ھ میں دکن میں بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی جس نے رفتہ رفتہ تقریباً تمام جنوبی ہند پر غلبہ حاصل کر لیا، جب اس وسیع وعریض اور مضبوط ومستحکم حکومت کا خاتمہ پونے دوسو سال بعد ۹۳۴ھ م ۱۵۲۷ء میں ہوا تو اس کے پانچ صوبیداروں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا، چنانچہ بیجاپور میں یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ میں ''شیعیت'' پر مبنی ''عادل شاہی'' حکومت کی داغ بیل ڈالی، اقتدار سنبھالنے کے بعد سلطان یوسف عادل شاہ نے اپنے امراء ووزراء اور ارکانِ دولت کو جمع کر کے اپنا یہ دعویٰ پیش کیا کہ ''میں نے خدائے بزرگ وکارساز ومسبب سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ مجھے کسی دن بادشاہی عطا کرے گا تو میں شیعہ مذہب اور امامیہ مسلک کو رواج دوں گا اور سارے ملک میں اس کی خوب تشہیر کراؤں گا، نیز شیعہ ائمہ کے نام سے خطبہ جاری کروں گا'' (۱) یوسف عادل شاہ (متوفی: ۹۱۶ھ م ۱۵۱۰ء) کے بعد اس کے فرزند اسماعیل عادل شاہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی

بقول مولف ''بساتین السلاطین'' اسماعیل عادل شاہ کی حکومت جب مستحکم ہوگئی تو اس نے سنی طریقہ کے خطبے کو بدل کر شیعہ مسلک کو بڑھاوا دیا اور اپنے باپ سے کچھ زیادہ ہی اس معاملہ میں دلچسپی دکھائی، اس نے اپنی فوج کے سبھی سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے سروں پر سرخ تر کی ٹوپی اس طرح پہنیں کہ ایک پر ایک کل بارہ ٹوپیوں کی ایک ٹوپی بن جائے (جو بارہ اماموں کی نشاندہی کرتی ہے)'' (۳)۔اسماعیل عادل شاہ (متوفی: ۹۴۱ھ م ۱۵۳۴ء) کا جانشین سلطان ابراہیم عادل شاہ اول ہوا، وہ اپنے باپ دادا کے برخلاف اہل السنۃ والجماعۃ کا متبع و پیروکار رہا، سلطان ابراہیم اول (متوفی: ۹۶۵ھ م ۱۵۵۷ء) کی حکومت ۹۴۱ھ تا ۹۶۵ھ تقریباً چوبیس سال رہی، بعد ازاں ولی عہد علی عادل شاہ نے اپنی موروثی حکومت کا اقتدار سنبھالا، اس نے اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی روز حکم نافذ کیا کہ اذانوں میں ''اشھد ان علیاً ولی اللہ'' کا اضافہ کیا جائے اور جمعہ کے خطبہ سے خلفائے راشدین میں سے ابتداء کے تینوں خلفاء کا نام حذف کر دیا جائے اور ان کی جگہ پر شیعہ عقیدے کے مطابق ائمہ اثنا عشریہ کے اسمائے گرامی لیے جائیں۔(۴) علی عادل شاہ (وفات: ۹۸۸ھ م ۱۵۸۸ء) کے بعد اس کا برادر زادہ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی بن طہماسپ بن ابراہیم عادل شاہ اول (متوفی: ۱۰۳۷ھ م ۱۶۲۶ء) بڑا ہی عالم و فاضل اور فنونِ لطیفہ کا ماہر تھا، خصوصاً فن موسیقی میں اسے کمال حاصل تھا، اس کے اکثر گویے غیر مسلم تھے جن کی صحبت سے اس کے عقائد بھی متاثر ہو گئے تھے اور وہ ''جگت گرو'' کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کا میلان طبع موسیقی کی دیوی ''سرسوتی'' کی طرف ہو گیا تھا اور وہ اس کی تعظیم کیا کرتا تھا، مورخ شہیر محمد ابراہیم زبیری (متوفی: ۱۰۹۴ھ مطابق ۱۶۸۳ء) کا بیان ہے کہ اس کو ارتداد کے دلدل سے باہر نکالنے کے لیے حضرت شاہ وجیہ الدین گجراتیؒ کے شاگرد و خلیفہ حضرت سید شاہ صبغۃ اللہ حسینی مدنیؒ (متوفی: ۱۰۱۵ھ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منامی حکم کے ذریعہ بیجاپور تشریف لائے، حضرت شاہ صاحب نے ۱۰۰۰ھ میں بیجاپور پہنچ کر ابراہیم عادل شاہ ثانی کی بدعقیدگی کی اصلاح فرمائی اور اسے دوبارہ راہِ راست پر لگا دیا (۵) ابراہیم عادل شاہ ثانی کی وفات کے بعد اس کے لائق و فائق فرزند سلطان محمد عادل شاہ (متوفی: ۱۰۶۷ھ) نے اپنے والد کے مقبرے ''ابراہیم روضہ'' پر قرآن کریم کی آیت کریمہ ''ما کان ابراھیم یھودیاً و لا نصرانیاً ولکن کان حنیفاً مسلماً'' یعنی حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے بلکہ سیدھی راہ پر گامزن خالص مسلمان تھے، لکھوایا۔

عادل شاہی حکومت کے قیام کے فوری بعد نظام الملک بحری نے جنوبی ہند کے ایک بڑے قطعے پر ''نظام شاہی'' سلطنت ۸۹۵ھ میں قائم کی، اس کے بیٹے ملک احمد (متوفی: ۹۱۴ھ م ۱۵۰۸ء) نے ''نظام شاہ'' کے لقب کے ساتھ ۹۰۰ھ میں ایک نیا شہر احمد نگر آباد کیا اور اسی کو اپنا پایہ تخت قرار دیا، انہی دنوں ایک شیعہ بزرگ شاہ طاہر ۹۲۸ھ مطابق ۱۵۲۱ء میں احمد نگر تشریف لائے اور انہوں نے شیعیت کی اس قدر تبلیغ کی کہ عوام تو کجا خواص سلطنت امراء و وزراء بھی بے حد متاثر ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''شیعیت'' کو سرکاری مذہب کا درجہ دے دیا گیا (۶) حکومت کی سرپرستی میں ''شیعیت'' کا چلن نظام شاہی سلطنت کے ڈیڑھ سو سالہ دور (۸۹۵ھ تا ۱۰۴۱ھ) میں جاری و ساری رہا، بعد ازاں مغل حکمراں شہاب الدین شاہ جہاں (متوفی: ۱۰۷۴ھ) نے دولت آباد اور احمد نگر کو مغلیہ سلطنت کا اٹوٹ حصہ بنا دیا۔

انہی دنوں تلنگانہ کے صوبہ دار سلطان قلی ہمدانی (متوفی: ۹۵۰ھ م ۱۵۴۳ء) نے بھی ۸۹۰ھ کے آس پاس اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنا لقب سلطان قلی قطب شاہ رکھتے ہوئے گول کنڈہ کو اپنا پایہ تخت مقرر کیا، چونکہ سلطان قلی شیعہ مذہب کا پیروکار تھا، اس لیے اس نے اپنی سلطنت میں شیعیت کو فروغ دے کر مستحکم کر دیا، یہ بڑا اجرائت مند و صلح پسند تھا تاہم ۹۵۰ھ میں جامع مسجد میں نماز ادا کرتے ہوئے قتل کر دیا گیا (۷)۔ اس کے بعد جمشید قطب شاہ (متوفی ۹۵۷ھ م ۱۵۵۰ء)، ابراہیم قطب شاہ (متوفی: ۹۸۸ء م ۱۵۸۰ء)، اردو کا اولین صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ (متوفی: ۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ء)، محمد قلی (متوفی: ۱۰۳۵ھ م ۱۶۲۵ء) عبداللہ قطب شاہ (متوفی ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء) اور ابوالحسن تانا شاہ (متوفی: مابعد ۱۰۹۸ھ) یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آئے، آخری سلطان کے سوا باقی تمام سلاطین اہل تشیع سے تھے۔

انہوں نے اپنی سنی رعایا پر ظلم و جور روا نہیں رکھا بلکہ عدل و انصاف کے ساتھ دو صدیوں سے زائد عرصے تک حکومت کرتے رہے، یہ بات مسلم ہے کہ جنوبی ہند کے اکثر و بیشتر حکمران مذہباً شیعہ ہونے کے باوجود عوام کے خیر خواہ، امن پسند، مصالحت کیش اور رعایا پرور واقع ہوئے تھے، اس کے باوجود انہوں نے اپنے مذہب کی ترقی و ترویج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، اس دور میں ملک ایران سے جہاں خالص شیعہ حکومتیں قائم تھیں، تعلقات کافی مستحکم ہو گئے تھے۔ اس کے اثرات بھی

جنوب کے عوام وخواص پر بہت گہرے اور دیر پا ثابت ہوئے۔ دو صدیوں پر محیط اس صورت حال کے بعد بارہویں صدی آئی تو شیعیت کا رنگ مزید چوکھا ہوگیا، اس پر مستزاد یہ کہ بارہویں صدی میں دکن میں قائم شدہ آصف جاہی حکومت کے حکمران قمر الدین خان نظام الملک آصف جاہ اول (متوفی: ۱۱۶۲ھ م ۱۷۴۸ء) سے اس صدی کے اختتام میں موجود نواب میر نظام علی خان نظام الملک آصف جاہ دوم (متوفی: ۱۲۱۸ھ م ۱۸۰۳ء) تک جتنے والیان ریاست آئے سبھی سنی مذہب کے متبع تھے، اس کے باوجود ان کے اکثر امراء ورؤسا چونکہ شیعہ تھے اس لیے مجموعی صورت حال میں کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔

اسی طرح جنوبی ہند کے مشرقی حصے صوبۂ آرکاٹ کے حکمران نواب سعادت اللہ خان نائطی (متوفی: ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء)، نواب علی دوست خان بن نواب غلام علی خان (متوفی: ۱۱۵۳ھ م ۱۷۴۰ء)، نواب صفدر علی خان ولد نواب علی دوست خان (متوفی: ۱۱۵۵ھ م ۱۷۴۲ء)، نواب محمد سعید معروف بہ سعادت اللہ خان دوم پسر نواب صفدر علی خان مقتول (متوفی ۱۱۵۷ھ م ۱۷۴۴ء)، شمس الدولہ حسین دوست علی خان عرف چندا صاحب (متوفی ۱۱۶۶ھ م ۱۷۴۸ء) وغیرہ سبھی اہل تشیع سے تھے۔ حالانکہ انہوں نے اپنی حکومتوں میں نظم ونسق، عدل وانصاف اور صلح وصفائی کو اولیت دی تھی تاہم ان کے دور میں شیعیت ایک تناور درخت کی صورت برگ وبار لا چکی تھی، اس ۳۳ سالہ نائطی حکومت کے بعد نواب محمد انور الدین شہامت جنگ شہید (شہادت ۱۱۶۲ھ م ۱۷۴۹ء) اور ان کے فرزند ارجمند نواب محمد علی والا جاہ گوپاموی ثم مدراسی (ولادت: ۱۱۳۵ھ وفات: ۱۲۰۱ء) کی حکومت جنوبی ریاست کرناٹک پر قائم ہوئی تو امراء ورؤسا میں شیعہ اور سنی دونوں عقائد کے ماننے والے موجود تھے، نواب والا جاہ کے ایک پوتے تاج الامراء محمد علی حسین خان ماجدؔ ولد نواب عمدۃ الامراء بن نواب والا جاہ (متوفی: ۱۲۱۶ھ) غالی شیعہ تھے تو دوسرے پوتے نواب عبد العلی خان عظیم الدولہ ولد امیر الامراء بن نواب والا جاہ پکے سنی تھے۔ جنہوں نے اردو کے اولین نقاد، ماہر السنہ علامہ باقر آگاہ ویلوریؒ کے قتل کی سازش کو جو شیعوں کی طرف سے رچی گئی تھی ناکام بنا دیا تھا (۸)۔ یہ وہ دور تھا کہ اس میں شیعیت اپنی توسیع پسندی کی وجہ سے سنیوں کے رگ وریشہ میں سرایت کرگئی تھی۔ یہ سنگین صورت حال جنوبی ہند ہی کی نہیں تھی بلکہ شمالی ہند میں بھی بارہویں صدی ہجری میں سیاسی اور مذہبی حالات کی یہی نوعیت تھی،

بقول مولف ''دکن کی سیاسی تاریخ'' بہادر شاہ (محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول متوفی ۱۱۲۳ھ مطابق ۱۷۱۱ء، ابن اورنگ زیب عالم گیر (متوفی ۱۱۱۸ھ م ۱۷۰۶ء) کی اہم سیاسی غلطیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اپنی حکومت کی ابتداء ہی میں احکام جاری کردیے کہ خطبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ لفظ ''وصی'' استعمال کیا جائے۔ یہ دوسرے الفاظ میں اس امر کا اعلان تھا کہ سلطنت کا مذہب ''طریق اہل سنت'' کے بجائے ''شیعیت'' ہوگیا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جس کی بیشتر آبادی ''سنی'' تھی، جس کی حکومت ابتدائے سلطنتِ اسلام سے سنی مذہب کی پیرو رہی تھی اور جس کے تخت پر اس سے پہلے پچاس سال تک عالم گیر جیسا کٹر سنی بادشاہ متمکن رہ چکا تھا، بہادر شاہ کا اپنی حکومت کی ابتداء ہی میں علی الاعلان شیعیت اختیار کرلینا اور خطبہ جمعہ کو بدل دینا، سیاسی اعتبار سے ایک نہایت دوررس فعل تھا(۹)۔ الغرض ان غیر معمولی حالات میں رشد وہدایت کا بیڑا شمالی ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے فرزندان ورفقا نے اٹھایا تو جنوبی ہند میں مذکورہ ناسازگار و وحشت ناک ماحول میں اصلاح وارشاد کا فریضہ حضرت سید خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ نے اپنے تلامیذ وخلفاء کو ساتھ لے کر انجام دیا۔

خواجہ سید شاہ رحمت اللہ حسینی ملقب بہ نائب رسولؐ اللہ کے اجداد بغرض اشاعت دین و اعلائے شرعِ متین عرب وعجم کے مختلف مقامات سے گزر کر بالآخر توران (موجودہ ازبکستان) پہنچے اور وہیں مقیم ہوگئے، پھر ایک عرصہ بعد ان کے والد ماجد حضرت سید شاہ خواجہ عالم حسینی نقشبندیؒ عہد شباب ہی میں اشارۂ غیبی پاکر توران سے ہندوستان تشریف لائے اور خلق خدا کی تعلیم وتربیت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ حضرت خواجہ عالم ابتدا میں دکن کی آصف جاہی سلطنت کے بانی میر قمر الدین علی خاں آصف جاہ اول (دور حکومت: ۱۱۳۷ھ تا ۱۱۶۲ھ) کی مصاحبت میں رہے، خواجۂ عالم اور میر قمر الدین آصف جاہ (ولادت: ۱۰۸۲ھ م ۱۶۷۱ء) ہم عصر ہونے کے علاوہ اجداد تورانی کے لحاظ سے ہم سر بھی تھے(۱۰)۔ آصف جاہ جب اورنگ زیب عالم گیر (عہد حکومت: ۱۰۶۹ھ تا ۱۱۱۸ھ) کی ملازمت میں تھے اور انہیں ۱۱۰۲ھ میں ''چین قلیچ خان'' کا خطاب عطا کیا گیا تو اس زمانے میں خواجہ عالم بھی غالباً ان کے ساتھ تھے، اس کے بعد خواجہ عالم دہلی سے دکن آگئے اور ریاست کرناٹک کے شہر ''بلگام'' میں سکونت پذیر ہوگئے جہاں ان کا تقرر شہر کی جامع مسجد کے خطیب کی حیثیت سے

ہوگیا(۱۱)۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد ان کے علم وفضل اور تقویٰ وطہارت کی شہرت ہر طرف ہونے لگی جس سے متاثر ہوکر بلگام کے ایک باوقار ودیندار اور کریم وشریف شخص نے اپنی خوبصورت ونیک سیرت صاحبزادی کو غالباً ۱۱۰۴ھ میں آپ کی زوجیت میں دے دیا پھر ایک سال بعد اسی عفت مآب خاتون کے بطن سے ۱۱۰۵ھ میں خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم والد کے زیر سرپرستی ہوتی رہی، کچھ ہی عرصہ بعد اچانک والدہ کا انتقال ہوگیا، اس جانکاہ حادثہ سے خواجہ صاحب کو بہت صدمہ ہوا اور وہ ملول رہنے لگے۔ پھر تھوڑی مدت بعد احباب کے اصرار پر ان کے والد نے نکاح ثانی فرمایا تاکہ خواجہ کو ماں کا پیار ملے مگر یہ سوتیلی ماں بڑی سخت گیر نکلی، وہ ان کے ساتھ بے مروتی اور بے توجہی سے پیش آتی، خواجہ صاحب نے بڑا صبر کیا اور کبھی حرف شکایت زبان پر آنے نہیں دیا، تاہم جب معاملہ ناقابل برداشت ہوگیا تو والد کی اجازت سے اپنے خالہ کے گھر ''کرنول'' (آندھرا) پہنچے۔ بعد ازاں خالہ کی خواہش پر چند ماہ تک ایک امیر کے یہاں دو گھوڑوں کی ملازمت پر معمور ہوگئے، اس دوران آپ کا معمول تھا کہ ایک گھوڑے کی آمدنی ضرورت مندوں پر خرچ کردیتے اور دوسرے گھوڑے کی تنخواہ اپنی خالہ کے سپرد کردیتے (۱۲)۔ کرنول اس وقت جید علما و ماہر اساتذہ کا مرکز تھا، خواجہ صاحب نے وہاں قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور معقولات کا درس مختلف ماہرین سے حاصل کیا اور بہت کم عرصے میں علوم متداولہ میں کمال پیدا کرنے کے ساتھ ہی اپنے احباب ومحبین کے اصرار پر اپنا حلقہ درس قائم فرمایا۔ ان کی درسگاہ میں طلبہ کی کثرت تھی اور تشنگانِ علم دور دراز مقامات سے کشاں کشاں چلے آتے تھے، اس تعلیم وتدریس کے دوران ان کو باطنی علوم کی تحصیل کا شدت سے خیال پیدا ہوا تو بیجاپور کا رخ کیا جہاں ساداتِ ''حضرموت'' کے چشم وچراغ حضرت سید علوی بروم ؒ ابن حضرت سید عبداللہ بروم ؒ کی بارگاہ مرجع خاص وعام تھی، انہوں نے حضرت بروم کے دست حق پرست پر بیعت کی اور چاروں سلسلوں میں خلعت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

حضرت خواجہ رحمت اللہ بیجاپور سے دوبارہ کرنول تشریف لائے، اس زمانے میں کرنول کا حاکم نواب الف خان پنی (عہد حکومت: ۱۱۴۶ھ تا ۱۱۵۹ھ) ولد ابراہیم خان پنی معروف بہ بہادر خان برسر اقتدار تھا جو سلطنت مغلیہ کے نامور سپہ سالار اور دکن کے صوبہ دار داؤد خان پنی (متوفی: ۱۱۲۲ھ م ۱۷۱۰ء) کا برادر زادہ تھا۔ خواجہ کی تشریف آوری کے وقت وہاں زبردست قحط کا عالم تھا، لوگ بھوکے

پیاسے مر رہے تھے، بقول سید ابو سعید والا مدراسی (متوفی: ۱۲۶۴ھ) وہاں (کرنول) کے نواب الف خان پسر ابراہیم خان نے مشائخ وفقرائے وقت سے نزولِ باراں کی دعا کے لیے التجا کی، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ نواب بے حد فکر مند ماہئ بے آب کی طرح مضطر تھے کہ ایک روز اچانک ایک مجذوب نے ان سے بجلی کی طرح کڑک کر کہا کہ اٹھ اور سید رحمت اللہ کے پاس جا، ان کی ایک ہی توجہ سے تیری مراد برآئے گی، نواب مرحوم نے اپنے خادموں سے دریافت کیا کہ یہ سید رحمت اللہ کون ہیں؟ خادمین نے کہا کہ یہ ملازم سرکار ہیں اور فلاں رسالے سے منسلک ہیں، نواب تیزی سے اٹھا اور ہاتھی پر سوار ہو کر ابر کی طرح اس بحرِ رحمت کی طرف روانہ ہوا، جیسے ہی نواب کی نظر ان پر پڑی جس طرح ابر سے قطرہ ٹپک پڑتا ہے نواب اپنے ہاتھی سے کود کر خواجہ صاحب کے قدموں کو چومنے دوڑے، حضرت (خواجہ رحمت اللہ) نواب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے فرودگاہ تک لے گئے اور انہیں پُرتکلف فرش پر بٹھایا، نواب نے اپنی حاجت بیان کی، حضرت نے فرمایا کہ کارساز کریم بے ہمتا اور مسبب الاسباب کی عمومی رحمت سے بعید نہیں کہ عنقریب ابر رحمت جوش میں آ کر اپنے بندوں کی کھیتیاں سیراب کرے، نواب نے خاموش ہو کر رخصت ہونے کی اجازت لی، ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ آسمان پر ابر نمودار ہوا پھر اس قدر برسا کہ نواب کو گھر تک پہنچنے کے لیے گھٹنوں گھٹنوں پانی سے گزرنا پڑا۔(۱۳)

اوراد ووظائف میں انہماک اور ریاضت ومجاہدات کے باوصف آپ کی طبیعت میں ایک طرح کی بے کلی اور دلی اضطراب پیدا ہو گیا تھا، باطن میں مزید نعمت کی طلب صادق محسوس ہونے لگی تھی، ایک دن اسی بے چینی کے عالم میں نیم غنودگی کی کیفیت طاری ہوئی، اچانک حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور یہ بشارت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے حاصل ہوئی کہ ”رحمت اللہ، تمہارا حصہ سید اشرف مکی کے پاس ہے“ خواجہ رحمت اللہ کے لیے یہ خوش بختی کی معراج تھی، ادھر کرنول میں رونما بارش کی کرامت کا چرچا ہو چکا تھا۔ خواجہ صاحب سے شرف ملاقات پانے اور دعائیں لینے کے لیے عوام وخواص کا ازدحام ہونے لگا تو انہوں نے حضور اکرمؐ کے حکم کی تعمیل میں حج بیت اللہ کے لیے روانگی کا عزم کر لیا اور سفر پر نکل پڑے، مکہ مکرمہ جاتے ہوئے ملیبار کے ساحلی موضع ”کوئی لانڈی“ (کالی کٹ) تشریف لائے تو وہاں کے مشہور صاحب حال وقال بزرگ حضرت سید حامد بن محمد سے

ملاقات کی، حضرت سید حامد نے ان سے فرمایا کہ واپسی میں بھی ضرور ملتے جائیں، چنانچہ واپسی میں انھوں نے دوبارہ حضرت سید حامد سے ملاقات کی تو سید صاحب نے ان کو دیکھتے ہی فرمایا "چاندی تو تھے ہی، اب خالص سونا بن کر آئے ہو" (۱۴)۔ حضرت خواجہ کو سید حامد رفاعی نے سلسلۂ رفاعیہ میں خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت خواجہ ارکان حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ کے حدود میں داخل ہوئے تو پابرہنہ تھے اور آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے، دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی سرزمین پر جب تک رہے یہی حالت طاری رہی، پھر وہاں سے اجازت مرحمت ہوئی تو مکہ مکرمہ میں کعبۃ اللہ کے قریب واقع جبل ابوقبیس پہنچے، جہاں حضرت سید اشرف مکی (متوفی: ۱۱۴۹ھ) ایک عرصے سے قیام پذیر مراقبے میں مستغرق تھے۔ بقول مولف "حیات رحمت" حضرت خواجہ رحمت اللہ ادب کے ساتھ حضرت اشرف مکی کے روبرو بیٹھ گئے۔

جب موصوف نے مراقبے سے فراغت حاصل کی تو دیکھا کہ سامنے رحمت اللہ بیٹھے ہوئے ہیں، پہچان لیا اور خود ہی مخاطب ہوئے، سلام و جواب کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری ہوا حضرت سید نے فرمایا، "رحمت اللہ! میں نے جب سے آقائے دو جہاں کا حکم پایا ہے، تمہارا منتظر تھا، تم خوب آئے" حضرت سید اشرف نے خود دوگانہ ادا کیا اور خواجہ رحمت اللہ سے بھی فرمایا کہ دوگانہ ادا کرو، اس کے بعد حقائق و معارف کے دفتر کھولے، خواجہ رحمت اللہ کو سارے علوم باطنی کی تعلیم فرمائی، یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری رہا، تب انھوں نے حضرت خواجہ (سلسلۂ نقشبندیہ میں) کو خرقہ عطا فرمایا۔ (۱۵)

حضرت خواجہ سفر حرمین شریفین سے فراغت کے بعد جدہ سے بندرگاہ سورت (گجرات) ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں تشریف لائے (۱۶)۔ تو سورت میں اس دور کے مشہور بزرگ حضرت سید شاہ علی گجراتی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاہ صاحب سے سلسلۂ نقشبندیہ میں دوبارہ خلافت واجازت حاصل کی اور خود شاہ صاحب ان سے سلسلۂ قادریہ میں خرقۂ خلافت سے مستفیض ہوئے۔ بعدازاں کرنول تشریف لائے، وہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا اور خانقاہ کی بنیاد رکھی جس سے سیکڑوں لوگوں کو آخرت سنوارنے کا موقع ملا، پھر وہاں سے نندیال پہنچے، نندیال میں ان کا نکاح ایک دیندار خاتون سے ہوا جن کے بطن سے ایک لڑکی تولد ہوئی، مگر چند دنوں بعد ہی زچہ بچہ دونوں داغِ

مفارقت دے گئے، اس اندوہ ناک سانحہ کے بعد انہوں نے کڈپہ کا رخ کیا، ایک مدت تک کڈپہ شہر میں ان کا قیام رہا، وہاں انہوں نے سنتوں کو فروغ دیا، بدعات وخرافات کا قلع قمع کیا، بقول مولف حیاتِ رحمت ''یہاں شادی بیاہ کے مختلف رسوم کا بہت التزام ہوا کرتا تھا، اس میں ایک قبیح رسم یہ تھی کہ شب گشت کے موقع پر مساجد میں سامعہ نوازی ہوا کرتی، حضرت خواجہ رحمت اللہ نے جب یہ دیکھا تو دنگ رہ گئے، انہوں نے مساجد میں باجا بجانے سے منع کیا لیکن جب ایک برات والے نے بات ماننے سے انکار کیا اور باجا بجاتے ہوئے مسجد میں داخل ہوا تو انہوں نے اس باجا بجانے والوں اور باراتیوں کو اپنے ہاتھ سے سنگسار کیا جس سے وہ ہیبت زدہ ہو گئے اور سارے کڈپہ سے یہ غلط رواج ختم ہو گیا''۔(۱۷)

حضرت خواجہ کے پند ونصائح اور اصلاح وارشاد کی وجہ سے کڈپہ اور اس کے اطراف کے عوام وخواص کو بے حد فائدہ پہنچا، بے شمار لوگ ان کے معتقد ومرید ہو گئے، یہ دیکھ کر وہاں کے رؤسا کو بھی بیعت کی خواہش ہوئی چنانچہ کڈپہ کے معروف ومشہور حاکم نواب عبدالنبی خان میانہ (متوفی:۱۱۵۸ھ) کے فرزندان جناب عبدالمحمد خان میانہ اور نواب عبدالحمید خان میانہ (متوفی:۱۱۶۱ھ) اور حمید خان کے لڑکے نواب عبدالمجید خان میانہ شہید (شہادت:۱۱۶۹ھ) اور نواب عبدالسعید خان میانہ والی ''گنجی کوٹا'' ان کی خدمت میں بیعت کی آرزو لے کر بار بار حاضر ہوتے مگر خواجہ صاحب نے غالباً دنیا سے اپنی بے رغبتی کی وجہ سے ان کو حلقہ بیعت میں شامل نہیں کیا(۱۸)۔البتہ عبدالنبی خان کے ایک نیک اور صالح صاحبزادے نواب عبدالسلام خان میانہ کو شرف بیعت بخشا، حضرت خواجہ نواب مذکور کے باغ ہی میں قیام پذیر تھے، چند دنوں بعد ہی نواب عبدالسلام عرف چھموں میاں کسی موذی مرض میں مبتلا ہو گئے، کڈپہ کے مشہور اطبا اور عاملین سے علاج کرایا گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، آخر کار نواب موصوف کے اہل خانہ نے خواجہ صاحب سے شفایابی کے لیے دعا کی درخواست کی تو انہوں نے فرمایا کہ عوام میں رواج پائے ہوئے ٹونے اور گنڈے نہ کرو، اللہ تعالیٰ سے امید رکھو انشاء اللہ شافی مطلق صحت یاب فرما دے گا، پھر انہوں نے مریض کو اس کے محل سے بلوا کر اپنے یہاں باغ میں رکھا اور اس پر مسلسل توجہ فرمائی اور بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے رہے، یہاں تک کہ نواب مذکور مکمل صحت یاب ہو گئے۔(۱۹)

حضرت خواجہ کڈپہ کے قیام کے بعد ادگیر (موجودہ ضلع نلور، آندھرا پردیش) روانہ ہوئے،

ادگیر تشریف لانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے ان کے خلیفہ حضرت شاہ محمد نظام الدین قادری مصنف عقیدت الطالبین (تصنیف شدہ: ۱۱۸۲ھ) رقم طراز ہیں:

''انہوں (حضرت خواجہ رحمت اللہ) نے وہاں (ادگیر) کے قلعہ دار سید عبدالقادر خان کو اپنا فرزند فرمایا تھا جبکہ ایک دفعہ ان کے والد (سید بدرالدین بن سید مصطفیٰ) سخت بیمار ہو گئے تھے اور حالت مرض میں اپنے بیٹوں کو حضرت کے سپرد کر دیا تھا، اس وقت سے اب تک خواجہ صاحب تمام امور میں سید موصوف کی طرف توجہ فرماتے رہے ہیں، اس سپردگی کے بعد ان کے والد صحت یاب ہو گئے، سید عبدالقادر خان بچپن ہی سے مرد صالح زاہد و عابد اور سخی و سعادت مند ہیں، حضرت کے ساتھ کمال اعتقاد رکھتے ہیں اور نہایت ادب سے پیش آتے ہیں شاید اس سبب سے خواجہ صاحب نے ادگیر میں قیام فرمایا''۔(۲۰)

علاوہ ازیں سید عبدالقادر خان (متوفی: ۱۲۲۱ھ) حضرت خواجہ کے مرید با اخلاص بھی تھے اور وہ دکن کے مشہور بزرگ حضرت مولانا علامہ محمد حسین بیدری شہید (شہادت: ۱۱ر رمضان ۱۱۰۸ھ) کے فرزند ارجمند حضرت مولانا احمد ابوتراب بدویلی کڈپوی (متوفی: ۱۱۳۶ھ) کے نواسے بھی تھے۔(۲۱) جس کی وجہ سے حضرت خواجہ کے دل میں نواب سید عبدالقادر خان کی محبت جاگزیں تھی، اس کے باوجود جب سید موصوف نے علاقہ ادگیر کے موضع انا سمندر کو فقراء کے خرچ کے لیے بطور نذرانہ پیش کرنا چاہا تو انہوں نے نذرانہ قبول نہیں فرمایا بلکہ وہاں کی تھوڑی بنجر زمین اور کچھ کھیت قیمت ادا کر کے خرید لیے اور اس مقام پر ایک شہر بسایا جسے ''رحمت آباد'' کہا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ رحمت اللہ جس دور میں ادگیر میں سکونت پذیر تھے، اسی زمانے میں کرنول کے نواب الف خان پنی (متوفی: ۱۱۵۹ھ) کے ذہن میں بار بار یہ خیال آتا رہا کہ حضرت خواجہ کی دعاؤں کے طفیل کرنول کی قحط سالی دور ہوئی اور ملک میں خوشحالی و شادابی آئی، اس کے علاوہ ان کے اپنے کئی ذاتی مسائل بھی خواجہ صاحب کے مشورے سے حل ہو گئے جس کی وجہ سے انہیں سکون و اطمینان نصیب ہوا۔ لہٰذا حضرت خواجہ کی خدمت اقدس میں ایسا گراں قدر تحفہ پیش کیا جائے جس کو قبول کرنے میں انہیں تردد نہ ہو۔ نواب صاحب اسی سوچ میں تھے کہ اچانک ان کی نگاہ اپنی اکلوتی حسین و جمیل بیٹی ''حبیبہ'' پر پڑی، ذہن میں الہامی طور پر یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ''حبیبہ'' کو ان کے حبالۂ عقد میں دے

دیا جائے، نواب صاحب نے اپنی اہلیہ محترمہ و دیگر اہل خانہ سے مشورہ کیا، سبھی نے اس پر بے انتہا مسرت کا اظہار کیا بعدازاں لڑکی سے بھی اس کی رائے معلوم کی گئی تو اس نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کردی، اس کے بعد نواب صاحب کے عزیزوں کا ایک قافلہ حضرت خواجہ کی منظوری حاصل کرنے کے لیے ادگیر روانہ ہوگیا، حضرت نے ان احباب کو سن کر فرمایا کہ کیا امیرزادی مجھ فقیر کے ساتھ زندگی بسر کرسکے گی؟ تاہم معتقدین کے اصرار پر حضرت نے اس رشتہ کے لیے اجازت مرحمت فرمادی، پھر دونوں فریق کی رضامندی سے ایک تاریخ طے کی گئی، جس میں بالکل سادگی اور مسنون طریقہ پر نکاح کرنول کی رئیس زادی حبیبہ خاتون سے ہوا، حبیبہ خاتون صوم وصلوٰۃ کی پابند، متبع شریعت، قرآن و حدیث اور فقہ وفلسفہ کی عالمہ تھیں بقول مصنف ''حیات رحمت'' وہ (حبیبہ خاتون) حضرت خواجہ کی سچی رفیق حیات، صابروشاکر، خدمت گزار سب سے بڑھ کر یہ کہ پکی دیندار اور خداترس بزرگ تھیں، ہر حال میں خوش وخرم رہا کرتیں۔ حضرت خواجہ کو بال برابر تکلیف نہ ہونے دیتیں، ہمہ تن ان کی خدمت میں مصرف رہتیں، یہی نہیں صبح وشام سیکڑوں آدمیوں کے لنگر کے انتظامات کی دیکھ بھال کے علاوہ حضرت خواجہ کے مہمانوں، درویشوں، صوفیہ اور طالبان علم کے خوردونوش کا پورا بار اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھتیں۔(۲۲)

حضرت خواجہ کے متبعین ومعتقدین میں خواتین کی خاص تعداد تھی، حضرت خواجہ نے اپنی اہلیہ محترمہ کی عمدہ صلاحیتوں کی بنا پر عورتوں کے مسائل کی آگاہی اور ان کی دلجوئی وعقدہ کشائی کے لیے عورتوں کو حبیبہ خاتون کے سپرد کردیا تھا، جنہیں لوگ ماں جی صاحبہ کہا کرتے تھے۔ وہ مسلمان عورتوں میں وعظ ونصیحت اور پند وہدایت کرنے کے علاوہ غیرمسلم خواتین میں اشاعت دین اور تبلیغ اسلام کا فریضہ بھی بحسن وخوبی انجام دیتی تھیں، ماں جی صاحبہ کا وصف خاص اور امتیازی صفت یہ تھی کہ انہیں ان کے والدین کی طرف سے وقتاً فوقتاً جو بھی نقد، تحفہ جات اور زروزیور ارسال کیے جاتے وہ تمام حضرت خواجہ کے خالص دینی، امت کے رفاہی اور انسانیت کے فلاحی کاموں کے لیے وقف کردیتیں، چنانچہ اس مقصد کے تحت حضرت خواجہ نے مستقر ''رحمت آباد'' کے اطراف واکناف میں دس گاؤں خرید کر آباد فرمائے ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔عالم پور (والد کے نام سے منسوب) ۲۔بڑا حبیبہ پور ۳۔چھوٹا حبیبہ پور (اہلیہ کے نام سے

منسوب)۴۔نبی نگر(نبی اکرمؐ سے منسوب)۵۔حسنا پور(سیدنا امام حسن سے منسوب)۶۔علوی پور(اپنے شیخ حضرت علوی بروم سے منسوب)۷۔رسول آباد(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب)۸۔اکبرآباد (خواجہ کے برادر نسبتی حضرت اکبر سے منسوب)۹۔عائشہ پور(حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے منسوب)۱۰۔احمد پور(حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام نامی سے منسوب)۔آخر الذکر احمد پور کی آمدنی حضرت نے مدینہ منورہ کے لیے وقف کردی تھی اور وہ رقم وہیں روانہ کی جاتی تھی (۲۳)۔حضرت جب کبھی وہاں تشریف لے جاتے تو پانی اپنے ساتھ لے آتے تھے، اس وقف شدہ گاؤں کا پانی تک استعمال نہیں فرماتے تھے، اس مبارک و مسعود قریے سے اس قدر تعلق خاطر تھا کہ ان کے خلیفہ حضرت علامہ شاہ رفیع الدین قندھاریؒ کا بیان ہے کہ "جس شخص کے دل کی کلی حضرت کے لطف و کرم سے کھل اٹھتی تھی تو اسے اپنے ہمراہ اس بستان سرا میں لے جا کر فصل بہار کی مانند خرقۂ خلافت سے سرفراز فرما دیتے تھے، چنانچہ میری روح کو بھی اسی جگہ (احمد پور میں) اپنے ارشاد کی خوشبو سے معطر فرمایا اور کمال شفقت سے خرقۂ مذکور سے نوازا" (۲۴) مذکورہ دس گاؤں دراصل دس تبلیغی و دینی مراکز تھے جن میں اشاعت اسلام اور اصلاح معاشرہ کا کام شائستہ طریقہ پر ہوتا تھا، اسی کی برکت و تاثیر رحمت ہے کہ آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس علاقہ میں دین و ایمان زندہ اور اسلام تابندہ ہے۔

حضرت غیر مسلم رعایا کے ساتھ بڑی رواداری اور محبت سے پیش آتے تھے، مذکورہ دس قریوں کے باشندوں کی سہولت و راحت کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے، وہاں کی آمدنی میں کبھی کمی واقع ہوجائے تو اپنے عمّال کو برا بھلا نہیں کہتے تھے بلکہ اس کمی کی بھرپائی اپنے جیب خاص سے کردیتے تھے، بعض وقت چند نادانوں کے رویے سے تکلیف بھی پہنچتی تھی تو انہیں دل سے معاف فرمادیتے تھے، اس تعلق سے آپ کا مسلک و مشرب "وفا کنیم و جفا می کشیم و خوش باشیم کہ در طریقت ما کافریست رنجیدن" کے مصداق تھا۔توکل و استغنا کا عالم یہ تھا کہ کسی نواب و رئیس اور وزیر و امیر کے نذرانوں اور جاگیروں کو شرف قبولیت نہیں بخشی، نواب کرناٹک محمد علی والا جاہ (متوفی:۱۲۱۰ھ) نے ان کے خلیفہ محمد صبغۃ اللہ عرف باوا صاحب کے بدست "ترچنا پلی" (تمل ناڈو) سے موضع "سیکل" کی جاگیر کا پروانہ خدمت میں روانہ کیا تو انہوں نے اسے قبول نہیں کیا، اسی طرح دکن کے حکمران آصف جاہ میر قمرالدین نظام الملک کے پانچویں فرزند نواب بسالت جنگ (متوفی:۱۱۹۵ھ) جاگیردار ادھونی ۱۱۷۳ھ میں ان کی بارگاہ

میں حاضری دے کر عرض گذار ہوئے کہ رحمت آباد میں موجود خس پوش مسجد کو پختہ و مضبوط تعمیر کرنے کی اجازت مرحمت کی جائے اور تعمیر مسجد کا تخمینہ دو ہزار ''ہون'' ان کی نذر کی تو انھوں نے رقم لوٹا دی اور اسے شریعت پر عمل کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو مسجد پختہ بن جائے گی چنانچہ ۱۱۷۶ھ میں حضرت خواجہ نے خود اپنے صرف خاص سے اس مسجد کی تعمیر مستحکم فرمائی اور اس کا نام مدینہ مسجد رکھا، مسجد کی پیشانی پر قطع تاریخ بایں طور کندہ ہے ؎

توئی اہل یقیں را اہل قبلہ   بشانت فوق ایدیھم ھو اللہ
بہر کس را توئی امید رحمت   خلیل آسا نمودی کعبۃ اللہ
کہ ہاتف گفت در تاریخ مسجد   نمودند مسجد اقصیٰ رحمت اللہ (۲۵)

۱۱۷۶ھ

سلطنت آصفیہ کے امیر کبیر ارسطو جاہ نے ''شمس آباد'' دیہات کی سند پیش کرتے ہوئے قبول کرنے پر اصرار کیا تو آپ نے سند چاک کر کے پھینک دی، اس کے غضب و انتقام کی بھی پروا نہیں کی۔(۲۶) اہل حکومت واصحابِ ثروت سے دوری و بیزاری کی وجہ ان دنیاداروں کی بے عملی، شریعت مطہرہ سے لاپروائی اور قبیح رسوم و بدعات سیئہ میں گرفتاری تھی، حضرت نے یہ سب ان کی تنبیہ کے لیے کیا تھا، اسی جذبۂ خیر سگالی کے تحت حضرت خواجہ نے سلطان ہند ابونصر مجاہد الدین احمد شاہ بن محمد شاہ روشن اختر کی دعوت کو سلیقے سے رد کرتے ہوئے انہیں نصیحت فرمائی، چنانچہ ۱۱۶۱ھ میں جب کہ حضرت شہر کڈپہ (موجودہ آندھرا پردیش) میں مقیم تھے تو سلطان الہند کے ایک قاصد نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر سلطان کا عریضہ خدمت اقدس میں پیش کیا جس میں دہلی تشریف لانے کی دعوت دی گئی اور قدم بوسی کی شدید خواہش ظاہر کی گئی۔ سلطان کے خط کے ساتھ حضرت کے ایک پیر بھائی حضرت سید شاہ عبدالقادر دہلوی قدس سرہ (خلیفہ حضرت سید اشرف مکی) کا سفارشی مکتوب بھی ملفوف تھا، حضرت خواجہ نے اس کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا کہ ''خود کو شریعت بیضا پر ثابت قدم رکھ کر اپنے ہر دینی اور دنیوی عمل کو حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین اسلام کے موافق بنالو تو گویا تم نے تمام بزرگوں اور فقراء کی زیارت کرلی، اس میں دونوں جہاں کی بھلائی ہے، فقیر کو بادشاہ مجازی سے کام کیا؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہر چیز مہیا کر دی ہے اور کسی چیز کی محتاج نہیں''۔(۲۷) حضرت خواجہ دکن

کے تین معاصر و بہادر مسلم حکمرانوں کو وقتاً فوقتاً نصیحت فرماتے اور انہیں اتحاد و اتفاق سے رہنے کی تلقین کرتے رہے چنانچہ اپنی ایک مجلس میں فرمایا ''اگر نظام علی خان (آصف جاہ دوم، متوفی: ۱۲۱۸ھ حاکم دکن) محمد علی خان (نواب والا جاہ متوفی: ۱۲۱۰ھ حاکم کرناٹک) اور حیدر نائک (بانی سلطنت خداداد متوفی: ۱۱۹۵ھ نواب میسور) اپنی جگہ آپ رہتے ہیں تو بہتر ہے، اس میں مصلحت اور خلق کی بھلائی ہے''۔ حضرت کے خلیفہ حضرت شاہ نظام الدین قادری فرماتے ہیں '' جیسا کہ حضرت عالی نے فرمایا اللہ سبحانہ، جل شانہ نے اس وقت تک ان تینوں اشخاص کو اپنے حال پر رکھا لیکن بعد میں محمد علی خان، فضل الٰہی اور بزرگوں کی توجہ سے ان کو جو ملک اور جمعیت حاصل تھی اس کو کافی غنیمت نہ سمجھ کر حیدر نائک کے علاقے پر چڑھ دوڑے، جنگ کے ارادے سے جا کر شکست کھا کر آئے''۔(۲۸)

بارہویں صدی ہجری میں جبکہ حضرت خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ نے ردشیعیت وردِ بدعات کا بیڑا اٹھایا تو بدعتیوں نے حضرت کی سخت مخالفت کی، حضرت نے اپنے خلفا حضرت شیخ فخر الدین مہکری بے خود ویلوری (متوفی: ۱۱۴۳ھ) حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی ویلوری (متوفی: ۱۱۸۲ھ)، حضرت شیخ مخدوم عبدالحق ساوی (متوفی: ۱۱۶۵ھ)، حضرت جامی دکن سید شاہ کمال الدین بخاری کڈپوی (متوفی: ۱۲۲۴ھ)، حضرت سید شاہ مرتضیٰ ادھونوی (متوفی: ۱۲۰۰ھ)، حضرت شاہ محمد قطب خان (متوفی: ۱۲۰۳ھ)، ادیب شہیر حضرت شاہ ولی اللہ (متوفی: ۱۲۰۵ھ)، حضرت شاہ رفیع الدین قندھاری (متوفی: ۱۲۴۱ھ) وغیرہ کو ساتھ لے کر ایک تحریک کی صورت میں تقریر و تحریر کے ذریعہ اصلاح امت کا کام سرانجام دیا، اہل بدعت و اہل تشیع سے مناظرے بھی کیے، چنانچہ شیعہ حضرات کی طرف سے مشہور عالم و شاعر علامہ غلام حسین جودت بن جناب محمد یار خان نائطی ملقب بہ شہر استاذ (متوفی: ۱۲۱۳ھ) مناظرے میں شرکت کرتے تھے اور ہر بار انہیں ناکامی ہاتھ لگتی تھی۔ حضرت خواجہ کی توجہ کی برکت تھی کہ آخر کار حضرت جودت پکے صوفی بن گئے۔ بقول مولف تذکرۂ گلزار اعظم درآخر حال ترک لباس اہل دنیا نمود واز صحبت جاہ پرستانِ روزگار نفور و دوری بود''۔(۲۹)

حضرت خواجہ نے شیعیت کے فروغ کو روکنے کے لیے اور اس مذہب کے باطل عقائد کو قرآن وسنت سے رد کرنے کے لیے ایک کتاب بزبان فارسی ''تنبیہ الانام فی الزجر عن التابوت والاعلام'' (pp 84x13) کے نام سے تصنیف کی جس کی شہرت اس دور میں خوب ہوئی۔

حضرت خواجہ نے یہ کتاب حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی: ۱۲۳۹ھ) بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ردشیعیت میں تحریر کردہ مشہور و معروف تصنیف ''تحفہ اثنا عشریہ (سال تصنیف: ۱۲۱۵ھ) سے بہت پہلے لکھی تھی، یہ اس لیے کہ حضرت خواجہ رحمت اللہ کا وصال ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء کو ہوا تھا، علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی ثم اورنگ آبادی (متوفی: ۱۲۰۰ھ) نے تاریخی قطعہ کہا تھا ؎

شہِ ملک ولایت رحمت اللہ ز دنیا سوئے عقبیٰ رخت بربست
اگر پرسند تاریخ وصالش بگو ''با رحمت اللہ پیوست''(۳۰)

۱۱۹۵ھ

حضرت کے معتقد خاص علامہ باقر آگاہ ویلوری (متوفی: ۱۲۲۰ھ) نے اپنے قطعۂ تاریخ میں حضرت خواجہ کی روح پُرفتوح کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے:

سرِ اہل یقیں خواجۂ دیں ملاذ و ملجاءِ ہر سالکِ راہ
تنش وابستۂ حکم شریعت دلش از بر مقام و حال آگاہ
ازیں دارِ فنا بگذشت و بگذاشت دل احباب را در دردِ جانکاہ
برآمد از صریر خامہ فریاد بحق گردید واصل رحمت اللہ (۳۱)

۱۱۹۵ھ

حضرت کی کتاب ''تنبیہ الانام'' ایک مقدمہ تین تنبیہات اور خاتمہ پر مشتمل ہے اور اس کا مخطوطہ کتب خانۂ دیوان صاحب باغ رائے پیٹا، مدراس (چینائی) کا مخزونہ ہے۔ کتاب کے مشتملات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

مقدمہ در تعریف بدعت، تنبیہ اول در اثبات بدعیت نصب اعلام و تابوت، تنبیہ ثانی در بیان کبائر چند کہ ایں بدعت قباحت پیوند مفضی بآن ست تنبیہ ثالث درمیان بعضے از بدعت ہا کہ مناسبت تمام بہ بدعت اعلام دارد خاتمہ در ذکر فضائل عترت طاہرہ۔

حضرت کی دیگر دو نثری تصنیفات ''رسالۂ بدعت'' اور ''ارشاد نامہ'' بھی رد بدعات میں رقم کی گئی ہیں۔ ان کی تحریری کارناموں سے چراغ پا ہو کر بعض رافضیوں نے آپ کی وفات کی تاریخ ''آبِ سگ خبیث'' سے نکال کر اپنے خبث باطنی کی تشہیر کی تھی (۳۲)۔ حضرت خواجہ کی ایک منظوم تصنیف

''تنبیہ النساء'' عورتوں کی اصلاح اور ان کے باطل عقائد کی تردید میں معرض وجود میں آئی تھی جو جنوبی ہند میں مشہور ہونے کے علاوہ دکن دیش کے ہر گھر میں تقریباً تین سو سال سے پڑھی اور سنی جاتی تھی، اس رسالے کی وجہ سے خواتین میں خالص دینی شعور جاگا اور ان کے غلط رسم و رواج کی بیخ کنی ہوئی، اس طرح عورتوں کے گفتار و کردار میں صحت و سلامتی کا مزاج پیدا ہوا۔ مثنوی ''تنبیہ النساء'' سے چند شعر نموناً پیش کیے جارہے ہیں:

حمد بے حد ہے اسی سبحان کو جو کیا پیدا وہ جسم و جان کو
دو جہاں کا خالق دائم ہے وہ سب فنا آخر کے تئیں قائم ہے او
ایک ہے اور نیں شریک دوجا اسے غیر اوس کے نیں سمجھ پوجا کسے

سن سہاگن بات میری خوب سن میں کہوں قرآن کے مطلب کو چن
نام تنبیہ النساء اس کا دھروں مشرکاں کے رسم سب ظاہر کروں
یہ رسالے کو سدا پڑھنا ضرور کفر کے رسماں ترک کرنا ضرور

چھوت ہے کر فاتحہ چھوڑو نکو بندگی سے حق کے منہ موڑو نکو
فاتحہ اس گھر میں کرنا ہے روا چھوٹ اس کی اس کو ہے دوسروں کو کیا
چھوت ہے کر فاتحہ چھوڑوں گی توں مرد گاں کی بددعا لے دینگی توں

سن سہاگن بات میری رکھ نہ خام دیکھ تو فقہ و عقائد میں تمام
سب کتابوں میں نکاح مذکور ہے رسم تیرا کس میں نیں منظور ہے
بد کیے عاروس و نوشہ کو جواز دوزخی مت ہو چھوڑ کر روزہ نماز

نسخہ یو پڑھ کر دعا کرنا مجھے سورۂ الحمد با اخلاص سے
دو جہاں میں ہے گنہ بھاری مرا تم دعا دیو، ہووے گا مجھ کو پناہ
عرض مری تم سنو اے باشعور فضل سے اپنی مجھے بخشے غفور

حضرت خواجہ فارسی میں بھی شعر کہا کرتے تھے، ان کے مجموعۂ کلام کا پتہ نہیں چلا، البتہ

مختلف تذکروں میں حضرت کے تین شعر محفوظ ہوئے ہیں، ملاحظہ ہوں:

از درونِ خود شناس و کار با گفتار نیست بادلِ وحدت نظر کن، یار بے اغیار نیست

بر جمالی در کمالی طالب دیدار باش گر شناسی آں جمالت کار با انکار نیست

رحمتؔ اللہ حق بجوئی از خودی خود دور کن خود نباشی حق نماید "حجت و تکرار" نیست (۳۳)

الغرض حضرت خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ بارہویں صدی ہجری کے جید عالم دین، باکمال صوفیٔ صافی، بلند پایہ شاعر، مایہ ناز مرشد و مبلغ اور صاحب تصرف و کرامات بزرگ تھے، قاضی القضاہ علامہ ارتضیٰ علی خان صفوی خوشنود (متوفی: ۱۲۷۰ھ) نے اپنے والد ماجد حضرت قاضی القضاۃ مصطفیٰ علی خان صفوی مختار جنگ خوش دل (متوفی: ۱۲۳۴ھ) کا واقعہ نقل کیا ہے کہ نواب امیر الہند محمد علی والا جاہ نے اپنی مراد برلانے کے لیے دعا کروانے حضرت خوش دل کو حضرت خواجہ کی خدمت میں رحمت آباد روانہ کیا تو مدراس میں موجود حضرت کے ایک مرید افضل الدین محمد خان نے بھی اس موقع کو غنیمت جان کر ایک عریضہ ارسال کیا جس میں یہ درخواست کی گئی کہ میرے کام تو حضرت کی دعا سے بن جاتے ہیں مگر اس کام میں برکت نہیں ہو پارہی ہے، براہ کرم برکت کے لیے خاص دعا فرمائیں۔ حضرت خوش دل جب حضرت خواجہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو خواجہ نے ان کو دیکھتے ہی ایک شعر ارشاد فرمایا، جس سے خوش دل کی حاضری کا مقصد اور مدعیٰ سے واقفیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

از دست گدائے بے نوا ناید ہیچ جز آں کہ بصدق دل دعائے بکند

پھر حضرت نے اپنے مرید کے لیے فرمایا کہ میری دعا کا نتیجہ اور اس کی برکت اس لیے نظر نہیں آتی ہے کہ تمہاری والدہ کی آہ ہماری دعاؤں کے لیے باد صرصر بن کر درخت قبولیت کو خشک کر دیتی ہے (۳۴)۔ اسی طرح ۱۱۶۴ھ میں جب کہ حضرت کڈپہ میں فروکش تھے، ان کا ایک معتقد کرنول کے نواب بہادر خان نے ان کی خدمت میں ایک خط لکھ کر یہ اطلاع دی کہ اس نے اپنے دشمن والیٔ دکن نظام الدولہ میر احمد علی خان ناصر جنگ کو قتل کر دیا، حضرت خواجہ نے تحریر پڑھ کر غصہ کی حالت میں خط کے پشت پر ہی لکھا کہ تو نے بہت برا کام کیا ہے، لہٰذا اس گناہ عظیم کی پاداش میں دو ماہ کے اندر تیرا سر بھی تہہ تیغ کر دیا جائے گا، چنانچہ نواب بہادر خان بھی دو ماہ کی مدت میں مارا گیا۔ (۳۵)

حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت رحمت اللہ نائب رسول کی شخصیت بھرپور داعیانہ صلاحیتوں کی حامل

اور قائدانہ اوصاف میں کامل ہونے کے علاوہ جنوبی ہند میں باقاعدہ منظم فلاحی واصلاحی تحریک کے بانی و موسس ہونے کی وجہ سے تاریخ دعوت وعزیمت میں ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتی ہے جس کو بار بار پڑھا جائے اور اپنے ذہن ودل میں اس کے حرف حرف کی حفاظت کی جائے تاکہ ہماری آئندہ کی نسلوں کو اپنی منزل مقصود متعین کرنے میں کسی تکلف وتردد کی کیفیت سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ ہمیں ان بزرگان دین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

---

## مآخذ وحواشی

(۱) شاہ کمالؒ جامیٔ دکن، مخزن العرفان، بزم شہ میر، تلپولہ (کدری، آندھرا پردیش) مطبوعہ ۲۰۱۰ء، ص ۲۵۱۔ (۲) محمد ابراہیم زبیری، بساطین السلاطین (۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء) ترجمہ مولانا محبوب الرحمٰن عمری مدنی، سیکیاب ایسوسی ایشن، بیجاپور، کرناٹک، مطبوعہ ۲۰۱۵ء، ص ۵۰۔ (۳) ایضاً، ص ۶۱۔ (۴) ایضاً، ص ۹۶۔ (۵) ایضاً، ص ۲۴۸۔ (۶) ابوظفر ندوی سید، مختصر تاریخ ہند، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، مطبوعہ ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۴۔ (۷) ایضاً، ص ۱۳۵۔ (۸) محمد یوسف کوکن عمری افضل العلماء، خانوادۂ قاضی بدرالدولہ جلد اول، دارالتصنیف، مدراس، مطبوعہ ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۔ (۹) ابوالاعلیٰ مودودیؒ سید مولانا، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹیڈ، نئی دہلی، نیو ایڈیشن ۲۰۰۷ء، ص ۴۰/۴۱۔ (۱۰) محمد نظام الدین قادری شاہ، عقیدۃ الطالبین (فارسی) ترجمہ خواجہ صفی اللہ قدیری، تنقیح وتصحیح مولانا ڈاکٹر محمد عارف الدین شاہ، ناشر محمد عبداللہ بادشاہ، خطیب وامام، مسجد مدینہ رحمت آباد (نلور)، مطبوعہ ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۔ (۱۱) ایضاً، ص ۱۲۔ (۱۲) ابوسعید والا سید، بحرِ رحمت فارسی (تصنیف شدہ ۱۲۴۰ھ) ترجمہ ڈاکٹر یعقوب عمر، مطبع لکشمی آفسیٹ پرنٹنگ پریس، کاچی گوڑہ حیدرآباد، ۲۰۰۱ء، ص ۵۲۔ (۱۳) ایضاً، ص ۹۴/۹۵۔ (۱۴) ایضاً، ص ۶۷۔ (۱۵) محمد حبیب الدین قادری شرفی سید ''حیاتِ رحمت'' ناشر محمد اسلم خان، فوٹو فریم ورکس اینڈ بک سیلر، درگاہِ رحمت آباد شریف، اے ایس، پیٹا، ضلع نلور، مطبوعہ ۱۹۸۹ھ، ص ۴۸/۴۹۔ (۱۶) عقیدۃ الطالبین، ص ۱۴۔ (۱۷) حیات رحمت، ص ۵۴/۵۵۔ (۸) ''عقیدۃ الطالبین''، ص ۴۸، اور ''بحر رحمت''، ص ۹۰۔۹۱۔ (۱۹) ایضاً، ص ۶۵۔ (۲۰) ایضاً، ص ۵۰۔ (۲۱) محمد یوسف کوکن عمری افضل العلماء، خانوادۂ قاضی بدرالدولہ (جلد اول)، دارالتصنیف مدراس، مطبوعہ ۱۹۶۳ء۔ ص ۸۶، ۱۱۳۔ (۲۲) حیات رحمت، ص ۹۶۔ (۲۳) عقیدۃ الطالبین، ص ۱۷۔ (۲۴) بحر رحمت، ص ۱۳، ۷۰۔ (۲۵) عقیدۃ الطالبین، ص ۶۔ (۲۶) بحر رحمت، ص ۲۲۔ (۲۷) عقیدۃ الطالبین، ص ۴۷/۴۸۔ (۲۸) ایضاً، ص ۷۱۔ (۲۹) محمد غوث خان بہادر نواب اعظم، تذکرۂ گلزار اعظم، مطبوعہ مطبع سرکاری، ۱۲۷۲ھ، ص ۱۵۰۔ (۳۰) بحر رحمت، ص ۵۴۔ (۳۱) محمد یوسف کوکن افضل العلماء عربک اینڈ پرشین اِن کرناٹک (Arabic Persion in Canatic) مطبع امیرہ اینڈ کو، مدراس، ۱۹۷۴ء، ص ۱۰۴۔ (۳۲) ایضاً، ص ۱۰۴۔ (۳۳) ایضاً، ص ۱۰۳۔ (۳۴) بحر رحمت، ص ۹۸۔ (۳۵) ایضاً، ص ۱۰۰، عقیدۃ الطالبین، ص ۶۵۔

# مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور رسالہ ''معارف''

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

ماہنامہ معارف بلاشبہہ علوم و معارف کا گنجینہ ہے۔ اردو رسائل و جرائد کے درمیان اس کا یہ امتیاز بھی لائقِ صد افتخار ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے سو سال پورے کر لیے ہیں۔

معارف کے امتیاز کے بہت سے پہلو ہیں۔ ازانجملہ اس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اپنے لائق و فائق مدیر سید سلیمان ندوی اور دیگر نامور رفقائے دارالمصنّفین کے گراں ارز مضامین و مقالات کی وجہ سے اس نے علمی و ادبی حلقوں کو بہت جلد اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ اہل علم بطور خاص اس کا مطالعہ کرتے اور اس کی فائلیں محفوظ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں مضامین و مقالات لکھ کر اپنی اور رسالے کی توقیر میں اضافہ بھی کرتے رہتے تھے۔ اس ضمن میں ایک اہم اور قابل ذکر نام محدثِ جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی (۱۹۰۱ء۔ ۱۹۹۲ء) کا بھی ہے۔

مولانا اعظمی کا شمار نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے علمائے کبار میں کیا جاتا ہے۔ وہ علمائے متقدمین کی طرح جامع العلوم والفنون تھے۔ بالخصوص علم حدیث اور اس کی مختلف شاخوں میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی سیرت و شخصیت اور علمی خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے دو جلدوں پر مشتمل ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی کی ''حیاتِ ابوالمآثر'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مولانا اعظمی نے اپنی پختہ علمی استعداد، درس و تدریس کی اعلیٰ صلاحیت اور تحریر و تصنیف پر قدرت کی بنا پر اپنے عہد کے اکابر علما کا اعتماد کم عمری ہی میں حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کے مرشد و مربی حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور اساتذۂ کرام میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ان کے حق میں کلماتِ تشجیع و تحسین ارشاد فرمائے ہیں۔ مدیر معارف مولانا سید سلیمان ندوی کا نام نامی بھی اسی

---

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

میں شامل ہے۔ وہ باوجودیکہ عمر اور علمی شہرت و عظمت میں مولانا اعظمی سے فائق و برتر تھے، لیکن ان کی حذاقت علمی کے معترف و مداح تھے۔ اس لیے بطور خاص ان کے ساتھ انس و محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔ مولانا اعظمی بھی دارالمصنّفین کے کتب خانے سے استفادے اور سید صاحب سے ملاقات و مذاکرات کے لیے وقتاً فوقتاً اعظم گڑھ جاتے رہتے تھے۔ سید صاحب کے پاکستان منتقل ہوجانے کے بعد مکتوب بنام مفتی ظفیر الدین مورخہ ۲۰؍اگست ۱۹۵۱ء میں اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سید صاحب دام ظلہ کا تہہِ دل سے ممنون ہوں کہ مجھ کو بھولے نہیں ہیں۔ مجھ کو بھی کسی کے پاکستان چلے جانے کا کوئی رنج نہیں لیکن حضرت مولانا شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ اور سید صاحب کے پاکستان منتقل ہوجانے کا صدمہ دل سے کبھی نہیں جاسکتا۔ پہلے جب کبھی جی گھبراتا تھا تو دن بھر کے لیے اعظم گڑھ چلا جاتا تھا۔ سید صاحب سے جی بھر کے باتیں ہوتی تھیں اور سارا غم غلط ہوجاتا تھا افسوس کہ اب یہ سہارا بھی نہیں رہا۔ شاید نومبر میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے دارالمصنّفین گیا تھا، پھر جب سے آج تک نوبت نہیں آئی"۔ (حیات ابوالمآثر، ا/ ۵۳۳)

جہاں تک "معارف" کا تعلق ہے تو اس میں مولانا اعظمی کا پہلا مضمون "جواد ساباط" کے عنوان سے اپریل ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا ہے، یہ نہایت معلومات افزا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ جواد ساباط ایک عرب تھے جنھوں نے ہندوستان میں تیرہویں صدی ہجری میں عیسائی مبلغین کی ملمع کاری کا پردہ چاک کیا اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ اس مضمون میں اولاً جواد ساباط کے سلسلۂ نسب اور خاندانی حالات تحریر کیے گئے ہیں پھر خود جواد کے احوال و کوائف بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد تبلیغ مسیحیت کے مقابلے کے سلسلے میں جواد کی خدمات کا مفصل بیان کیا گیا ہے۔

اس مضمون کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جواد نے مسیحیت کے مقابلہ کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ ظاہری طور پر اسلام چھوڑ کر مسیحیت میں داخل ہو گئے اور پھر خود کو انجیل کا عربی ترجمہ کرنے پر مامور کرالیا۔ بعض معمولی وقفوں کے ساتھ وہ اس کام میں چودہ برس تک مصروف رہے۔ مگر درپردہ وہ مسیحیت کے جال کا تار و پود بکھیرتے رہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دو معرکہ آرا کتابیں لکھیں۔ جن میں ایک کا نام "الصراصر الساباطية" اور دوسری کا "البراهين الساباطية" ہے۔ اول الذکر شائع نہ ہوسکی لیکن ثانی الذکر شائع ہوئی اور مصنف نے اسے خفیہ طور پر مفت تقسیم کرایا۔ اس

کتاب کی تصنیف واشاعت میں جواد کو کن کن مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟ اس کی تفصیلات بھی مضمون میں پیش کی گئی ہیں۔ پورا مضمون نادر اور مفید معلومات سے پُر ہے۔ جواد عربی کے علاوہ فارسی اور اردو سے بھی واقف تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ۳۰ تک پہنچتی ہے جن میں بیشتر عربی میں اور بعض فارسی اور اردو میں ہیں۔ حیرت ہے کہ خیر الدین زرکلی کی الأعلام جواد ساباط کے ذکر سے خالی ہے۔

معارف میں مولانا اعظمی کا ایک اور مضمون اگست ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے: ''الدراية فی تخريج أحاديث الهداية'' کا ایک نادر نسخہ الدراية کے مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔ ان کی یہ کتاب زیلعی کی نصب الراية کی تلخیص ہے۔

مولانا نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ ان کا پیش نظر نسخہ خود مصنف کی زندگی میں اور تصنیف کے صرف تین سال بعد ۸۳۰ھ میں لکھا گیا ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کاتب ابوالفتح محمد بن احمد خطیب طوخی نویں صدی ہجری کے مشہور عالم وکاتب ہیں۔ سخاوی کی ''الضوء اللامع'' میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے مشہور بزرگ وعالم مولانا غلام یحییٰ بہاری قدس سرہ کی ملک رہ چکا ہے۔

ان تمام خصوصیات سے بڑھ کر اس نادر نسخے کا امتیاز یہ ہے کہ اس پر حافظ ابن حجر کے بلند پایہ شاگرد جلیل القدر مصنف اور نویں صدی کے مشہور حافظ حدیث علامہ قاسم بن قطلو بغا کے تعلیقات و حواشی ثبت ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ نسخہ خود علامہ قاسم کے مطالعہ میں رہ چکا ہے اور اس پر خود ان کے دستِ مبارک سے تعلیقات درج ہیں۔

ان تعلیقات کی اہمیت یہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے جلیل القدر محدث جن احادیث کی تخریج میں ناکام رہے ہیں، علامہ قاسم نے اپنی تعلیقات میں ان کی نشان دہی فرمائی ہے۔ ذیل میں اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''حدیث ''لا نكاح إلا بشهود'' کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے:
>
> ''لم أره بهذا اللفظ'' اس پر علامہ قاسم فرماتے ہیں: ''قلت أخرجه محمد بن الحسن فی الأصل بلاغا و صله الخطيب من حديث علی''۔

مولانا اعظمی نے پیشِ نظر مضمون میں اس طرح کے ۲۹ استدراکات نقل کیے ہیں۔اس سے اس مضمون کی افادیت نیز مولانا کے ذوقِ تحقیق کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔آخر میں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مولانا نے ان استدراکات کو "تعلیقات الحافظ قاسم بن قطلو بغا علی الدراية" کے عنوان سے "منية الألمعي بمافات الزيلعي" کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں ہی مصر سے شائع کرادیا تھا۔

مولانا اعظمی کا ایک اور مضمون "مبارق الازھار کس کی تصنیف ہے؟" کے عنوان سے معارف، جنوری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔مولانا نے اس مضمون کی تمہید میں بتایا ہے کہ عبداللطیف بن ملک یا ابن فرشتہ ایک مشہور مصنف اور نامور عالم ہیں۔ان کی تصنیفات میں مشارق الانور کی شرح مبارق الازھار کو بہت شہرت ومقبولیت حاصل ہے۔یہ شرح استنبول سے چھپ کر شائع بھی ہوچکی ہے۔لیکن قاضی سید نورالدین حسین نے معارف (جولائی ۱۹۴۹ء) میں اور ڈاکٹر سید باقر علی نے معارف (اکتوبر ۱۹۵۰ء) میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ یہ کتاب ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے جو احمدآباد کے باشندے تھے اور ان کے والد کا نام عبدالملک بنبانی تھا۔

مولانا اعظمی نے پیشِ نظر مضمون میں مذکورہ بالا دونوں مقالہ نگاروں پر تعقب کیا ہے اور دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ دونوں فاضل مقالہ نگاروں کا نیا انکشاف معیارِ تحقیق پر پورا نہیں اترتا اور تاریخی اعتبار سے کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں ہے۔اس ضمن میں مولانا نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ وہ تمام مصنّفین جنھوں نے ابن فرشتہ کا حال لکھا ہے یا جنھوں نے مبارق الازھار کا ذکر کیا ہے سب اس کو عبداللطیف بن الملک کی تصنیف بتاتے ہیں۔ملاحظہ ہو الضوء اللامع، الشقائق النعمانیه، اعلام الاخیار، شذرات الذهب، فوائد بهیه، اتحاف النبلاء، کشف الظنون اور مقدمۂ شرح وقایه وغیرہ۔ بلکہ مبارق کے مصنف نے خود اپنے نام کی تصریح اس طرح کی ہے وبعد فيقول العبد الضعيف عبداللطيف بن عبدالعزيز المعروف بابن الملك۔حاصل گفتگو کے طور پر مولانا نے بتایا ہے کہ عبداللطیف بن عبدالملک بنبانی احمدآبادی ایک دوسرے بزرگ ہیں جو مبارق الازھار کے مصنف نہیں ہیں۔

مولانا نے اپنے اس مضمون میں اصل موضوعِ بحث کے علاوہ بھی دونوں فاضل مقالہ نگاروں

کی متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا ہے، جس سے ان کی وسعت مطالعہ بالخصوص طبقات وتراجم کی کتابوں پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان سب سے قطع نظر مولانا کا یہ مضمون بعض ایسے اہم علمی نکات پر مشتمل ہے جنھیں خود ان کی دریافت کہنا چاہیے۔ مثلاً وہ یہ بتاتے ہیں کہ سخاوی نے الضوء اللامع میں بالعموم انہیں اعیان کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نویں صدی ہجری میں وفات پائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس طرف بھی متوجہ کرتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ سخاوی نے اس کتاب میں بعض ایسے عالموں کا بھی ذکر کردیا ہے جن کی وفات دسویں صدی ہجری میں ہوئی ہے مگر ان کا ذکر انھوں نے ایسے انداز میں کیا ہے کہ ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ جس کا ذکر کیا جارہا ہے وہ ابھی زندہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اس نکتے کی طرف وہی متوجہ کرسکتا ہے جس نے ''الضوء اللامع'' کا ایک سے زائد بار بہ نظرِ غائر اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو۔ یہ محض خوش گمانی نہیں بلکہ اس ضمن میں مولانا اعظمی کی ایک تصریح بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی ''حیاتِ ابوالمآثر'' میں رقم طراز ہیں:

> ''اس کتاب کی پہلی جلد کے سرورق پر علامہ اعظمی کے قلم سے یہ عبارت منقوش ہے: ''طالعت هذا الكتاب كله أعني اجزاءه الاثنى عشر قبل اليوم بسنوات مستعيرا إياه من مكتبة دار المصنفين ثم لما اشتريته لمفتاح العلوم شرعت فى قرائته ثانيا سنة ۱۳۶۹ھ''۔ (۴۸۶/۱)

مولانا اعظمی کا ایک اور مضمون ''پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں'' ہے۔ یہ معارف میں دو قسطوں میں اکتوبر، نومبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کی تمہید میں مولانا رقم طراز ہیں:

> ''پورب کے خطہ میں جو اولیائے کرام آسودۂ خاک ہیں اور ان کو شہرت دوام وقبول عام حاصل ہے، ان میں ایک برگزیدہ ہستی حضرت شاہ طیب بنارسی قدس سرہ کی ہے۔ ایک عرصے سے مجھے حضرت موصوف کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کا شوق تھا اور اس شوق میں مجھے ''مناقب العارفین'' کی تلاش وجستجو تھی جس کو ان کے حالات میں ان کے صاحبزادے شاہ محمد یٰسین قدس سرہ نے تصنیف فرمایا ہے۔ خوش قسمتی سے بنارس میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا اور میں اس کے مطالعہ سے بہرہ ور ہوا۔
>
> مجھے اس کتاب میں اچھا خاصا تاریخی وعلمی مواد نظر آیا۔ اس لیے میں نے اردو میں

اس کا خلاصہ قلم بند کرلیا اور آج اسی خلاصے کو ناظرین معارف کے سامنے پیش کررہا ہوں‘‘۔

اس طویل مضمون میں شاہ طیب بنارسی کے علاوہ جن دیگر بزرگوں کے احوال قلم بند کیے گئے ہیں، ان میں سے چند کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

شاہ محمد یٰسین، شیخ تاج الدین جھونسوی، مولانا خواجہ کلاں، شیخ نصیرالدین، شاہ حسن داؤد بنارسی، شیخ فرید بنارسی، خواجہ مبارک بنارسی، مخدوم محمد عیسیٰ تاج جون پوری۔

مولانا اعظمی کا پیش نظر مضمون اگرچہ ’’مناقب العارفین‘‘ فارسی کا اردو خلاصہ ہے، لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ تادم تحریر اصل فارسی قلمی کتاب ’’مناقب العارفین‘‘ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب تھا جو جامعہ مظہرالعلوم، پچی باغ، بنارس کے کتب خانے کی زینت تھا۔ راقم حروف نے ۲۰۔۲۲ سال قبل اس کی زیارت کی تھی۔ موجودہ صورتِ حال کا علم نہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا نے اپنے اس مضمون پر خود ہی استدراک بھی تحریر فرمایا تھا جو معارف میں جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے اپنی بعض فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ان کی اصلاح فرمائی ہے۔ اس سے مولانا کی احتیاط پسند طبیعت اور تحقیقی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا اعظمی کا ایک اور معرکہ آرا مضمون ہے ’’**الذخائر و التحف**‘‘ کس کی تصنیف ہے؟ یہ معارف میں فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ نہایت محققانہ مضمون ہے جو دو اہل علم ڈاکٹر حمیداللہ اور قاضی اطہر مبارک پوری کے درمیان اختلاف رائے کے بعد محاکمے کے طور پر تحریر کیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ’’**الذخائر و التحف**‘‘ جب ڈاکٹر حمیداللہ کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی تو انہوں نے اس کے مصنف قاضی الرشید بن الزبیر کی نسبت مقدمہ میں لکھا کہ ان کا حال ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا، مگر کتاب کی اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارک پوری نے معارف دسمبر ۱۹۶۰ء میں اپنی یہ تحقیق پیش کی کہ قاضی الرشید بن الزبیر کا تفصیلی ذکر تاریخ ابن خلکان میں موجود ہے اور وہ پانچویں نہیں، چھٹی صدی کے ایک جامع الفنون عالم تھے۔ قاضی صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد بھی ڈاکٹر حمیداللہ کی رائے یہی رہی کہ **الذخائر و التحف** کے مصنف پانچویں صدی ہجری ہی کے کوئی عالم تھے۔

مولانا اعظمی نے اپنے محاکے میں اولاً یہ بتایا ہے کہ قاضی الرشید بن الزبیر جن تین شخصیتوں کا لقب بتایا گیا ہے وہ تینوں معروف ہیں۔ایک تو وہی ابن خلکان والے القاضی الرشید، ان کا نام احمد ہے۔دوسرے ان کے والد علی ہیں اور تیسرے ان کے دادا ابراہیم ہیں۔اس کے بعد مولانا نے یہ بتایا ہے کہ والد اور دادا ان دونوں کا تذکرہ ہمارے دونوں فاضلوں کو نہیں مل سکا ہے، حالانکہ ان دونوں کا ذکر "الطالع السعید" مطبوعہ مصر ۱۳۳۳ھ میں موجود ہے۔علی کی نسبت یہ مذکور ہے کہ وہ فاضل، شاعر اور رئیس تھے اور ان کی وفات ۵۲۵ھ میں ہوئی ہے۔اور ابراہیم کی نسبت یہ مرقوم ہے کہ وہ ۴۷۳ھ میں اضلاع قوص کے حاکم تھے۔رشید و مہذب ان کے پوتے تھے۔اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ احمد اور علی کا زمانہ چھٹی صدی ہے اور ابراہیم کا زمانہ پانچویں صدی ہے۔

مضمون کے اگلے حصہ میں مولانا نے ان دلائل کا جائزہ لیا ہے جن کی بنا پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے الذخائر و التحف کی تصنیف کا زمانہ پانچویں صدی ہجری قرار دیا ہے۔پھر اخیر میں محاکمہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:

> "ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد ہمارے نزدیک ان ہی کی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے اور ہمارا رجان بھی اسی طرف ہے کہ 'الذخائر و التحف' ابن خلکان والے القاضی الرشید کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے دادا القاضی الرشید ابراہیم کی تصنیف ہے"۔

مولانا اعظمی نے اس مضمون میں بھی حسب معمول اصل بحث سے قطع نظر متعدد اضافی معلومات بہم پہنچائی ہیں نیز مختلف غلط فہمیوں کا ازالہ بھی فرمایا ہے۔

اب راقم حروف یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ جناب سہیل شفیق کے مرتبہ "اشاریہ معارف اعظم گڑھ" سے حاصل شدہ معلومات کے پیش نظر میرا خیال تھا کہ معارف میں مولانا اعظمی کے یہی پانچ مقالات شائع ہوئے ہیں جن کا تعارف گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا۔لیکن بعد میں حیات ابوالمآثر جلد اول سے مراجعت کے بعد معلوم ہوا کہ معارف میں مولانا اعظمی کی کچھ اور تحریریں بھی شائع ہوئی ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔دو متبرک اجازت نامے، دسمبر ۱۹۳۷ء۔ ۲۔تخریج زیلعی، جولائی ۱۹۴۰ء۔ ۳۔دینور اور

مشائخ دینور، اکتوبر ۱۹۶۵ء۔ ۴۔ابوعبید کی غریب الحدیث، اکتوبر ۱۹۶۷ء۔ ۵۔غریب الحدیث، فروری ۱۹۶۸ء۔ ۶۔فہرست مخطوطاتِ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، اپریل ۱۹۷۹ء۔

افسوس ہے کہ وقت کی قلت اور پیش نظر مضمون کی طوالت کی وجہ سے ان سب مضامین ومقالات کا تفصیلی تعارف سرِ دست ممکن نہیں۔ البتہ اپنے چند تاثرات کا پیش کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(الف) مولانا اعظمی ماہ نامہ معارف کے مستقل اور صاحب نظر قاری تھے اور بالعموم اس میں شائع ہونے والی تحریروں کو وہ بہ غور پڑھتے تھے اور جب کبھی کسی مقالہ نگار کی اصلاح وتصویب کی ضرورت محسوس کرتے تھے تو اسے متنبہ فرما دیتے تھے اور اس ضمن میں بہت سی نئی اور مفید معلومات بھی پیش کر دیتے تھے۔ فنون حدیث اور کتب طبقات وتراجم سے متعلق ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ تحقیق منسوبات سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ ان موضوعات سے متعلق ان کے استدراکات نہایت وقیع اور محققانہ ہیں۔

(ب) مولانا کے مضامین ومقالات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر بحث اور ہر گفتگو میں حسن ترتیب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کے مقالے کے اجزا میں بہ نظر غائر بھی تقدیم وتاخیر کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ (ج) مولانا اپنی تحریروں میں ایجاز بیانی اور لفظی کفایت شعاری کا بھی شعوری طور پر اہتمام فرماتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں آرائشی جملے اور فقرے یا غیر ضروری مرادفات نظر نہیں آتے۔

مولانا اعظمی کا سانحۂ وفات ۱۱ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء کو پیش آیا۔ اپریل ۱۹۹۲ء کے معارف میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے "محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی" کے عنوان سے مبسوط تعزیتی مضمون تحریر فرمایا۔ موقع ومحل کی مناسبت سے یہاں اس کا ایک مختصر اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "مولانا سلیس، شگفتہ، پُرمغز اور حشو وزوائد سے پاک اردو لکھتے تھے جو ماقل ومادل کا نمونہ ہوتی تھی۔ مستقل کتابوں کے علاوہ انہوں نے معارف اور برہان میں متعدد محققانہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان میں سے اکثر میں کسی مصنف یا مقالہ نگار کی فروگذاشتوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور یہ بڑے بیش قیمت ہیں جن سے علمی وتحقیقی کام کرنے والے بے نیاز نہیں ہو سکتے"۔

انہیں معروضات پر اس گفتگو کو ختم کیا جاتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اسے تحسین ناشناس پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

# علامہ شبلی کے چند خطوط

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مکتوبات شبلی کے دریافت ہونے کا سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ گذشتہ دنوں کتب و رسائل میں دس نئے خطوط دریافت ہوئے۔ اس میں دو خط برادر مکرم ڈاکٹر عطا خورشید صاحب اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عنایت کردہ ہیں۔ یہ خطوط اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ''حیات شبلی'' کے حوالہ سے ان میں بعض نئی معلومات ملتی ہیں اور ان دس خطوط میں نو خطوط کے مکتوب الیہ نئے ہیں جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ منشی نجم الدین (۱۸۷۰-۱۹۶۰ء) علی گڑھ۔ ۲۔ میر صدرالدین حسین خاں رئیس بڑودہ۔ ۳۔ آنریری سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس۔ ۴۔ مولانا اشرف علی ایم اے (۱۸۴۳-۱۹۰۸ء)۔ ۵۔ ایڈیٹر وکیل امرت سر۔ ۶۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد (۱۸۷۸-۱۹۴۷ء)۔ ۷۔ میر اصغر علی، حیدرآباد۔ ۸۔ مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور (۱۸۶۸-۱۹۳۳ء)۔ ۹۔ سید عبدالسلام۔

ان خطوط کی دریافت سے علامہ شبلی کے مکتوب الیہم کی تعداد ۹۹ ہوگئی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کے اب تک ۱۰۹۱ مکاتیب مدون ہوکر کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے:

| | |
|---|---|
| ۱۔ مکاتیب شبلی اول، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین ۲۰۱۰ء۔ | ۴۰۰ خطوط۔ |
| ۲۔ مکاتیب شبلی دوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین ۲۰۱۲ء۔ | ۳۷۹ خطوط۔ |
| ۳۔ خطوط شبلی، مولوی امین زبیری، مقدمہ ڈاکٹر شمس بدایونی، دہلی ۲۰۱۷ء۔ | ۱۰۳ خطوط۔ |

---

رفیق اعزازی دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ azmi408@gmail.com (Mob. 9838573645)

۴۔ مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء۔ ۲۰۹ خطوط۔

میزان | ۱۰۹۱ خطوط

مکتوبات شبلی کی اشاعت کے ایک سال بعد جولائی ۲۰۱۳ء میں راقم کی کتاب ''شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' شائع ہوئی، اس وقت تک علامہ شبلی کے مزید ۱۰/ خطوط دستیاب ہو چکے تھے۔ چونکہ مکتوبات شبلی کا دوسرا ایڈیشن جلد آنے کی توقع نہیں تھی اس لیے نودریافت خطوط کو ''شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' کے دیباچہ میں شامل کردیا گیا۔ (۹/ دیباچہ اور ایک حاشیہ ص ۳۹) نومبر دسمبر ۲۰۱۴ء میں ماہنامہ معارف کا شبلی نمبر نکلا۔ جس میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا مقالہ ''مولانا شبلی کے غیر مدون خطوط'' شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے مذکورہ بالا تمام خطوط کے ساتھ مزید تین خطوط اور دو مراسلوں کا اضافہ کیا ہے۔ جس سے خطوط کی مجموعی تعداد ۱۵/ ہوگئی ہے۔ حالانکہ اصل تعداد ۱۳/ رہے، اس میں مراسلہ کو شامل کرنا مناسب نہیں۔ راقم نے مراسلات شبلی کے نام سے علامہ شبلی کے ۲۶/ مراسلوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جسے دارالمصنّفین نے گذشتہ سال شائع کردیا ہے۔ مذکورہ بالا مراسلے بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ بہرحال راقم کی کتاب مکتوبات شبلی کی اشاعت (۲۰۱۲ء) کے بعد سے اب تک مراسلات کے علاوہ ۲۳ خطوط (۱۰+۳+۱۰=۲۳) دریافت ہو چکے ہیں۔ ذیل میں تازہ دریافت خطوط کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱)

منشی نجم الدین (۱۸۷۰-۱۹۶۰ء) سر سید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) کے رفیق اور علی گڑھ کے شیخ زادوں میں تھے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اکاؤنٹنٹ رہے۔ عمدہ خوش نویس بلکہ زود نویس تھے۔ قدیم کتب و مسودات کی نقل و تبییض کا کام مہارت سے کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سر سید کو کسی کتاب کو نقل کرانے کی ضرورت پیش آئی اور انھوں نے علامہ شبلی سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے منشی نجم الدین کا ذکر کیا اور ان کو لکھا:

''نجم الدین!

سید صاحب ایک کتاب لکھوانا چاہتے ہیں لیکن وہ صرف دو ہفتے کے لیے مستعار ملی ہے۔ تم سے مفصلہ ذیل باتوں کا جواب مطلوب ہے:

۱۔ تم مدرسے سے رخصت لے سکتے ہو یا نہیں اور لے سکتے ہو تو کب سے، کیونکہ آج اگر

رخصت ملے تو آج ہی سے کام شروع ہوجانا مقصود ہے۔

۲۔یہیں آ کر کتاب لکھنا ہوگا،صبح سے شام تک،کھانا دن کا سید صاحب کے ہاں سے ملے گا۔

۳۔اجرت خواہ اجزا پر خواہ ماہانہ حساب سے۔غرض جس طرح مرضی ہو مل سکے گی۔ والسلام

جواب طلب شبلی نعمانی''

یہ خط ڈاکٹر مختار الدین آرزو (۱۹۲۴-۲۰۱۰ء) نے اپنے مضمون سر سید کے ایک رفیق منشی نجم الدین مشمولہ فکر و نظر علی گڑھ ستمبر ۱۹۸۵ء میں عکس کے ساتھ درج کیا ہے۔خط پر تاریخ درج نہیں لیکن مذکورہ مضمون میں اسے جون ۱۸۸۹ء کا بتایا گیا ہے۔

(۲)

نواب میر صدرالدین حسین خاں رئیس بڑودہ نے ایک خط کے ذریعہ علامہ شبلی سے استفسار کیا کہ ناموران اسلام میں صرف سیرۃ النعمان اور المامون شائع ہوسکیں دیگر سوانح عمریوں کی تصنیف واشاعت میں تاخیر کے اسباب کیا ہیں۔علامہ شبلی نے ان کے جواب میں جو خط لکھا تھا اسے شیر علی خاں سرخوش نے نیرنگ خیال نومبر ۱۹۲۴ء میں شائع کرادیا ہے:

''جناب من تسلیم

والا نامہ پہنچا مشکور کیا،بے شبہہ میں نے بہت سے وعدے کیے تھے لیکن صورت یہ ہے کہ ایک الفاروق کی تالیف میں آج پانچواں برس ہے برابر مصروف ہوں اور ابھی تک انجام کو نہیں پہنچی، اس لیے ترکی کا سفر کیا ہندوستان کے تمام کتب خانے چھانے،یورپ سے کتابیں منگوائیں اس پر بھی کتاب ناتمام ہے۔قرطبہ اور نیشاپور کے درباروں کے سین دکھانے کے لیے ان ملکوں کا سفر کرنا چاہیے،اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے۔قوم کی قدردانی کا یہ حال ہے کہ کتاب کا ایک دو ایڈیشن بک جانا قدردانی کی معراج سمجھی جاتی ہے۔میں کچھ دولت مند آدمی نہیں۔تاہم کل مصارف خود اپنے پاس سے برداشت کیے اور کرتا ہوں۔اس میں جو کچھ بن آجاتا ہے اس کو غنیمت خیال کیجیے۔ باقی پوری سرگرمی سے کام ہونا تو ہم مسلمانوں سے کہاں ہوسکتا ہے۔یہ قرعہ اب دوسروں کے نام ہے۔و تلک الایام نداو لھا بین الناس۔ والتسلیم

شبلی نعمانی

الہ آباد، ۱۱؍ستمبر ۱۸۹۷ء"

مذکورہ بالا دونوں خطوط افضل حق قریشی کے مقالہ مشمولہ صحیفہ لاہور جولائی۔دسمبر ۲۰۱۴ء سے لیے گئے ہیں۔اس مضمون میں متعدد مراسلات بھی شامل ہیں جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔انہیں انشاءاللہ مراسلات شبلی کے طبع دوم میں شامل کیا جائے گا۔

(۳)

یہ خط آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری کے نام ہے اور "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال" مرتبہ امان اللہ خاں شروانی کے صفحہ ۲۱۸ پر شائع ہوا ہے۔

"مکرمی! تسلیم

جواباً عرض ہے کہ دفتر حیدرآباد میں ہے۔میں نے مدت ہوئی لکھا اور جواب آیا کہ روانہ کیا جاتا ہے اب تک نہ آیا۔اب بہ تاکید مزید لکھا ہے۔

رجسٹر میرے پاس ہیں۔وہ آج سکریٹری صاحب کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں۔

شبلی

لکھنؤ، ۲۰؍فروری ۱۹۰۱ء"

(۴)

حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۱۸۶۶۔۱۹۵۰ء) سے شبلی کے بڑے گہرے مراسم اور کثرت سے خط و کتابت رہی۔مکاتیب شبلی میں ان کے نام ۱۱۸؍خطوط، مکتوبات شبلی میں ۲۴؍خطوط اور بعد میں دریافت ہونے والے ۲؍خطوط کے بعد حال میں ان کے نام ایک اور خط دریافت ہوا ہے جو ماہنامہ الندوہ کی اشاعت سے پہلے کا ہے۔یہ خط مقالات یوم شبلی (مطبوعہ مسلم اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۸ء) میں شامل ہے، اس کے مرتب علامہ شبلی کے ایک شیدائی حافظ نذر احمد (م ۲۰۱۱ء) ہیں۔انہوں نے علامہ شبلی کے نام پر لاہور میں شبلی کالج قائم کیا تھا جسے انہوں نے آخر دم تک قائم رکھا اور جس سے بے شمار طلبہ نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔حافظ نذر احمد مرحوم نے ۸؍مئی ۱۹۶۸ء کو شبلی کالج لاہور میں قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد پہلی بار بڑے تزک و احتشام کے ساتھ یوم شبلی کا انعقاد کیا جس کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ نے کی اور جس میں پاکستان کے ممتاز اہل قلم نے شرکت کی اور مقالات پیش کیے۔

جولائی ۱۹۶۸ء میں ان مقالات کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا، اس میں تبرک کے طور پر علامہ کی ایک غیر مطبوعہ غزل اور ایک خط بھی شامل کیا گیا ہے، یہ خط اگست ۱۹۰۲ء کا مکتوبہ ہے۔ حافظ نذر احمد کو یہ خط کہاں سے دستیاب ہوا اس کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی ہے۔

''مکرمی تسلیم

نہایت خوشی ہوئی کہ ندوہ کا رسالہ نکلنا تجویز ہوا اور آپ کی اڈیٹری میں، تنہا اس بار کو اٹھاتے ہوئے گھبراتا تھا لیکن اگر آپ چاہیں تو اڈیٹری میں شرکت کر سکتا ہوں، رسالے کا پراسپکٹس عنایت فرمایئے گا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ علماء کو قائل کرنا ان کے مذاق کی رعایت سے ہو سکتا ہے اس لیے ہر پرچہ میں علوم قدیمہ میں سے کسی ایک پر ناقدانہ اور محققانہ ریویو بھی ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں جو پیمانہ ہے اس کو لکھ کر بھیجوں گا یا زبانی کہوں گا۔ الغزالی کا اشتہار دے دیا گیا لیکن اب تک کتاب چھپ کر نہیں آئی۔ شبلی

اگست ۱۹۰۲ء''

(۵)

علمائے صادق پور میں مولانا محمد اشرف علی ایم اے عربی (۱۸۴۳-۱۹۰۸ء) بڑے لائق فائق اور عالم فاضل شخص تھے۔ علوم دینیہ کے ساتھ علوم جدیدہ انگریزی، ریاضی اور طب وغیرہ میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ کچھ دنوں تک اودھ اخبار لکھنؤ کے ایڈیٹر اور بنارس میں ریاضی کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ فارسی کے بلند رتبہ شاعر تھے۔ علامہ شبلی کے ان سے گہرے روابط تھے۔ ان کے نام شبلی کا ایک خط ماہنامہ معاصر پٹنہ ستمبر ۱۹۴۲ء (ص ۳۲-۳۳) میں شائع ہوا ہے۔ جسے بعد میں ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے علی گڑھ کالج میگزین ۱۹۴۸-۴۹ء میں بھی شائع کیا۔

''مولانا!

آپ کے فضل و کمال کا مجھ سے زیادہ کون معترف ہوگا باوجود اس کے میں نے انجمن اردو میں آپ کو تکلیف نہیں دی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے اس طرف آپ کے میلان کا کوئی ذکر نہیں سنا تھا۔ آج ایک صاحب کے خط سے کچھ امید بندھی تو یہ عریضہ لکھتا ہوں۔ روداد انجمن اردو ارسال خدمت ہے۔ سب سے بڑا کام لغات علمیہ کا ترجمہ ہے۔ ناگری پر چار سبھا نے سات

جلدوں میں سائنٹفک لغت تیار کرلیا۔لیکن ہمارے یہاں کون کرے گا۔انگریزی داں عربی سے کورے ہیں وبالعکس مصطلحات کمسٹری الگ چھپوا لیے ہیں، وہ بھیجتا ہوں۔کیا آپ اس کا کوئی حصہ ترجمہ فرمادیں گے؟ ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ارسطو کی منطق کا جو انگریزی میں ترجمہ ہو گئی ہے، ترجمہ کیا جائے تا کہ موازنہ ہو سکے کہ مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا۔دوسرا کام میں کردوں گا، لیکن کیا آپ پہلا کام کردیں گے۔غرض آپ اس مد میں جو کچھ کرسکیں اس سے مطلع فرمائیں۔

شبلی

حیدرآباد،

۴رمئی ۱۹۰۴ء"

(۶)

سید محمود(۱۸۵۰ـ۱۹۰۳ء) نے جس وقت انتقال کیا علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے اور تراجم کا ایک بڑا منصوبہ ان کے پیش نظر تھا چنانچہ کسی شخص نے وکیل امرت سر میں لکھا کہ انجمن ترقی اردو سید محمود کی کتابوں کے ترجمے کروا کر شائع کرے۔اس کے جواب میں علامہ شبلی نے ایڈیٹر وکیل کو ایک خط لکھا جو ۱۳رنومبر ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

"مکرمی!

اخبار وکیل میں مضمون جو سید محمود مرحوم کی تصنیفات کے ترجمہ کے متعلق چھپا ہے میں نے پڑھا۔سید محمود صاحب کی خدمت میں مجھ کو ایک مدت مدید تک نیاز حاصل رہا ہے۔ان کی کوئی تصنیف انگریزی یا کسی اور زبان میں بجز شرح قانون شہادت نہیں ہے۔شفعہ پر انھوں نے ایک بسیط کتاب لکھنی چاہی تھی۔بہت سا مواد فراہم ہو چکا تھا، کچھ اجزا چھپے بھی تھے لیکن کتاب ناتمام رہی۔

مرحوم اخیر زندگی میں صرف اپنا سایہ ہو گئے تھے۔اس عالم میں محض مشغلہ گفتگو کے طور پر وہ اپنی بہت سی تصنیفات کا ذکر کرتے تھے اور لوگوں کو ادھر ادھر کے دو چار صفحے دکھا دیا کرتے تھے اس سے لوگوں کو دھوکہ ہوتا تھا۔

ان فرضی تصنیفوں کا انھوں نے صرف ایک ابتدائی خاکہ قائم کیا تھا اور دو چار صفحے لکھ بھی لیے

تھے۔باقی بے شبہ اگران کی کوئی تصنیف موجود ہوتی تو ترجمہ کے قابل ہوتی۔

شبلی“

(۷)

مشہور حساب داں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد (۱۸۷۸۔۱۹۴۷ء) کو علامہ شبلی سے خاص عقیدت تھی۔انہوں نے اپنی مجلس مقننہ کی تقریروں میں علامہ شبلی کے متعدد مقامات پر حوالے دیے ہیں۔انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تاسیسی جلسہ میں میجک لینٹرن سے لکچر دیا اور علمائے کرام کو ہیئت کے مسائل سمجھائے۔(العلم کراچی، جنوری ۱۹۵۲ء، ص ۴۲)

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد جس وقت جرمنی میں زیر تعلیم تھے اس وقت علامہ شبلی سے ان کی خط وکتابت تھی۔اسی دور کا ایک خط ماہنامہ العلم کراچی جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے، اس سے ایک دوسرے کے مراسم اور علم و تحقیق سے دونوں کے گہرے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔

”مجی

آپ کا خط مجھ کو کچھ دیر میں ملا کچھ اور اسباب سے جواب میں تاخیر ہوئی۔

۱۔قانون مسعودی رام پور کے کتب خانہ سرکاری اور قاہرہ کے کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے۔

۲۔ابوریحان کی تصانیف کی فہرست مفصل، ترجمہ انگریزی کتاب الہند مصنفہ ابوریحان بیرونی مطبوعہ لندن ۱۸۸۷ء میں جس قدر دی ہے۔اس سے زیادہ نہیں مل سکتی۔

۳۔اس کی اکثر تصنیفات علم ہیئت کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہیں۔

۴۔عمر خیام کی تصنیفات حسب روایت، تاریخ الحکماء شہرزوری جس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے حسب ذیل ہے۔

ایک مختصر رسالہ طبیعات میں۔ایک رسالہ وجود کی حقیقت پر۔ایک رسالہ لکون وتعلف پر۔عرایس النفایس۔

۵۔ابوریحان کا سنہ وفات طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ میں ۴۳۰ لکھا ہے اور کتاب مذکورہ بہت مستند خیال کی جاتی ہے۔

۶۔ابوریحان کی کتابیں کتب خانہ رام پور و پٹنہ وقاہرہ میں مل سکتی ہیں۔

مسلمان ریاضی دانوں میں سے ابوالوفاء جوزجانی۔ بتانی خازن بڑے پایہ کے لوگ اور مجتہدالفن ہیں ان کی تحقیقات پر بھی توجہ کیجیے۔

شبلی نعمانی

اعظم گڑھ، ۳۰/جنوری ۱۹۰۵ء"

(۸)

یہ خط بحرالحکمت کے مصنف میر اصغر علی محلہ عثمان شاہی اصغر منزل حیدرآباد دکن کے نام ہے۔ میر صاحب کے بارے میں مزید تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ یہ خط صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء (ص ۷۶) میں شائع ہوا ہے۔

"جناب من!　　سلام مسنون

آپ نے بہت مفید کتاب لکھی ہے۔ یہ ہر ایک کے لیے یکساں فائدہ رساں ہے۔ شکریہ قبول فرمایئے۔

شبلی

۶/مارچ ۱۹۱۳ء، لکھنؤ

(۹)

۲۴-۲۵/جنوری ۱۹۱۴ء کی درمیانی شب میں مشہور صحافی مولوی محبوب عالم (۱۸۶۸-۱۹۳۳ء) ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کے یہاں آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا جس سے ان کے مطبع اور لائبریری کو شدید نقصان پہونچا، مولوی محبوب عالم اس وقت سفر پر تھے اور ان کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالعزیز اخبار اور مطبع کے ذمہ دار تھے۔ اس ناگہانی حادثہ پر متعدد اشخاص نے پرسہ کیا اور خطوط لکھے۔ مولوی محبوب عالم نے وصیت نامہ لکھ کر اپنا تمام ذخیرہ علمی پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری کو دے دیا تھا۔ بعد میں اس ذخیرہ سے ایک البم برآمد ہوا جس میں آتش زدگی کے واقعہ پر اظہار افسوس کرنے والوں کے تار اور خطوط محفوظ کیے گئے تھے اس میں ایک دوسطری خط علامہ شبلی کا بھی ہے جسے ماہنامہ ماہ نو کراچی اکتوبر ۱۹۶۷ء میں ملک احمد نواز نے شائع کرادیا ہے جو درج ذیل ہے:

"مکرمی

تسلیم! کارخانہ کی آتش زدگی کی خبر سن کر نہایت افسوس ہوا۔ امید ہے کہ خدا بہت جلد تلافی

کردے گا۔ سفر سے واپسی پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ شبلی

لکھنؤ، ۴؍فروری ۱۹۱۴ء"

(۱۰)

درج ذیل خط صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء (ص ۶۱) میں شائع ہوا ہے۔ اپنے مشمولات کے لحاظ سے بے حد اہم خط ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس خط کے اقتباسات حیات شبلی (ص ۴۷) میں عقائد خیالات کے ضمن میں نقل کیے ہیں اور حیات شبلی ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط سید عبدالسلام صاحب مالک مطبع فاروقی دہلی کے استفسار پر لکھا گیا اور ۹؍مئی ۱۹۱۴ء کا لکھا ہوا ہے۔

"جناب میر صاحب! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

(۱) جس کا یہ عقیدہ ہو کہ مادہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے وہ ملحد اور زندیق ہے۔ میں مادے کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں نہ قدیم بالزمان البتہ میں یہ جانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں۔

الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں اور اس غرض سے نقل کیے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے۔

(۲) نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ اعتقاد نہیں ہے کہ وہ اکتسابی ہے اور ہر شخص نبی ہوسکتا ہے، میں نبوت کو عطیہ الٰہی سمجھتا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم الانبیاء یقین کرتا ہوں اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی ہوسکتا ہے اس کو مسلمان نہیں جانتا۔

(۳) باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں۔ میں عقیدتاً اور فقہاً دونوں لحاظ سے اہل سنت و جماعت سے ہوں۔ شبلی نعمانی

دہلی"

ان خطوط کی دریافت اور اشاعت سے علامہ شبلی کے ۹۹ مکتوب الیہ کے نام ۱۱۱۴؍خطوط محفوظ ہوچکے ہیں جو اہل علم سے کلیات مکاتیب شبلی کی ترتیب وتدوین کے متقاضی ہیں۔

# اخبار علمیہ

## ''غلط فہمیوں کی تردید کے لیے نئی رامائن لکھنے کا منصوبہ''

دنیا بھر میں تقریباً تین ہزار سے زائد رامائنیں تحریر کی گئی ہیں، جس میں گوسوامی شری تلسی داس کی بھرت رام چرت مانس رامائن کو سب سے زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔لیکن خبر ہے کہ آر ایس ایس نے اب تک لکھی گئی رامائنوں کو گمراہ کن قرار دیتے ہوئے نئے سرے سے رامائن تیار کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ان میں چھیڑ چھاڑ کرکے ایسے سیاق وسباق شامل کیے گئے ہیں جو رام کی بدنامی کا سبب ہیں۔ اکھل بھارتیہ تاریخ تالیف منصوبہ کے سکریٹری کے بیان کے مطابق بہت سے لوگ رام کی حقیقی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کررہے ہیں جب کہ ہندوستان کے لیے رام مریادا پرشوتم ہیں اور دنیا کے لیے ایک مثالی۔ سکریٹری کا کہنا ہے کہ ابھی تک لوگ یہی جانتے ہیں کہ رام نے سیتا کو جنگل بھیج دیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ رام نے کبھی سیتا کو جنگل نہیں بھیجا۔ رام ایک اچھے بیٹے، اچھے شاگرد اور اچھے شوہر بھی تھے۔ اس قسم کی روایتیں ہندو مخالف افراد نے شامل کی ہیں، جس کے سبب لوگوں میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کو دور اور قابل اعتراض حصوں کو حذف کرنے کے مقصد سے گورکھپور میں ایک قومی سمینار منعقد کیا جارہا ہے۔ اس میں رامائن کے ثقافتی، مذہبی، فلسفیانہ، سماجی، جغرافیائی، معاشی، لسانی اور رام کے تاریخی اور عالمی روابط کے موضوع پر بحث ہوگی۔

(تفصیل اخبار مشرق، کلکتہ، ۳/جولائی ۲۰۱۷ء میں دیکھی جاسکتی ہے)

---

## ''روزہ کا مفہوم انفکشن پھیلانے والی بیماری''

گجرات اسٹیٹ اسکول ٹیکسٹ بک بورڈ کی چوتھی جماعت کی ہندی نصابی کتاب میں روزہ کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے جس سے انفکشن ہوتا ہے اور قے اور دست کی شکایت لاحق ہوجاتی ہے۔ یہ سنگین غلطی پریم چند کی کہانی عیدگاہ کے آخر میں دی گئی فرہنگ میں کی گئی ہے۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کے سربراہ نیتن پیٹھانی کی توجہ جب اس جانب مبذول کرائی گئی تو انہوں نے اس کو طباعت کی غلطی قرار دے کر نصابی کتاب سے حذف کرنے کی اپیل کی ہے۔ لیکن سرگرم کارکن مجاہد نفیس کا خیال ہے کہ یہ غلطی دانستہ طور پر کی گئی ہے تاکہ اقلیتی طبقہ کے جذبات کو مجروح کیا جاسکے۔ اس سے قبل حضرت عیسی مسیحؑ

کی شان میں اہانت آمیز الفاظ کی نشان دہی کی گئی تھی۔ تاہم صدر بورڈ کا کہنا ہے کہ موجودہ کتاب ۲۰۱۵ء میں شامل نصاب کی گئی ہے۔ ماضی میں ایسی کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ متداول ایڈیشن میں یہ طباعتی غلطی موجود ہے، جس کے ۱۵ ر ہزار نسخے زیر گشت ہیں۔ آن لائن ورژن میں یہ غلطی نہیں ہے۔

(منصف، حیدرآباد، ۱۲ ر جولائی ۲۰۱۷ء)

---

## "۸ کتابیں جن کے مطالعہ کا مشورہ بل گیٹس نے دیا ہے"

مائیکروسافٹ ویر کے بانی بل گیٹس کو مطالعہ کا بھی شوق ہے۔ ٹائمس آف انڈیا نے ان سے متعلق اس خبر کو بڑی اہمیت دیتے ہوئے اخبار کی زینت بنایا ہے۔ یہاں ان کتابوں اور اس کے مصنّفین کی فہرست نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے لیے اس خبر کی وجہِ کشش اس فہرست میں ہندوستانی مصنف کا ہونا ہے۔ قارئین اپنے ذوق مطالعہ سے ان کتابوں کی اہمیت اور موضوع کا تعین کر سکتے ہیں۔ فہرست ملاحظہ فرمائیں: نک لین کی The Vital Question، جولین الاوڈ اور جانتھن کولن کی House on Fire: ولیم فاگ کی Sustainable Materials with Both Eyes Open، پال فارمر کی Infection and Inequalities: The Fight; to Eradicate Smallpox، یوول نوح ہراری کی Sapiens: A Brife History of Huma The Modern Plagues، سونیا شاہ کی The Fever: How Malaria Has Ruled Human Kind for Kind، نیل اسٹیفنسن کی 500,000 Years، سدھارتھ مکھر جی کی Seveneves The Gen: An Intimate History، بل گیٹس کو بہت پسند ہیں جن کو پڑھنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس میں بعض ماحولیات، بعض کائنات اور بعض بیماریوں کے موضوع پر ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۱ ر جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۱۳)

---

## "لیبیا نژاد مسلمان کا قابل تقلید اسوہ اور گورنر کی جانب سے اعزاز"

امریکہ میں مقیم ایک لیبیا نژاد مسلمان ۶۲ سالہ محمد بزیک نے اپنے آپ کو لاوارث اور ایسے معذور اور مختلف امراض کے شکار بچوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے، جن کا بوجھ ان کے والدین اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ ۱۹۷۸ء میں الیکٹرانک انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گئے۔ تعلیم مکمل ہوئی تو وہیں شادی کر لی، چند برس بعد ایک بچہ پیدا ہوا جو بیک وقت دو لاعلاج امراض کا شکار اور

چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ پھر ایک بچی پیدا ہوئی جو ڈیڑھ برس کی عمر میں انتقال کر گئی۔ اس کی موت کا میاں بیوی پر بہت گہرا اثر ہوا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے گھر میں ایسے بچوں کی پرورش و پرداخت و نگہداشت کریں گے، جنہیں ان کے والدین بوجھ سمجھ کر اسپتالوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر معذور بچوں کو گھر لانا شروع کیا اور ان کا گھر معذوروں کی نگہداشت کا مرکز بن گیا، جہاں ہر قسم کی طبی آلات اور دواؤں کا انتظام ہے۔ خودکار گاڑی بھی ان کے لیے محمد بزیک نے تیار کر رکھی ہے۔ اب تک دونوں مل کر ۸۰ بچوں کو اپنے گھر لا چکے ہیں، جن میں ۴۰ کا انتقال ہو چکا ہے۔ بعض شفایاب ہو کر والدین کے پاس جا چکے ہیں۔ متعدد بچے یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔ محمد بزیک کا کہنا ہے کہ یہ انتہائی مشکل کام ہے لیکن میں اور میری اہلیہ صرف اللہ کی رضا کے لیے ۱۹۹۵ء سے یہ کام کر رہے ہیں۔ ان معذور بچوں کو سنبھالتے ہوئے اہلیہ کا ۲۰۱۵ء میں انتقال ہو گیا۔ واضح رہے کہ لاس اینجلس میں ایسے معذور بچوں کی نگہداشت کے لیے محمد بزیک کے علاوہ کوئی دوسرا گھر نہیں۔ امریکی وزارت صحت کے مطابق ہر سال امریکہ میں ۴ لاکھ ۲۸ ہزار ایسے معذور بچے پیدا ہوتے ہیں جنہیں خصوصی نگہداشت کے مراکز میں رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان میں ۵۲ فیصد لڑکے اور ۴۸ فیصد لڑکیاں ہوتی ہیں۔ محمد بزیک کی اس عظیم خدمت کو سراہتے ہوئے گزشتہ دنوں لاس اینجلس کے گورنر کی جانب سے اعلیٰ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے اور انہیں "ہیرو" کا لقب دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ موجودہ صدر امریکہ نے اپنے یہاں جن مسلم ملکوں پر پابندی عاید کی ہے، ان میں لیبیا بھی ہے۔ (تفصیل منصف، حیدرآباد، ۱۲/ جولائی ۲۰۱۷ء میں دیکھی جا سکتی ہے)

---

## "جامعہ ام سلمہ، دھنباد کا صد فیصد نتیجہ"

جامعہ ام سلمہ دھنباد، جھارکھنڈ لڑکیوں کی دینی و عصری تعلیم و تربیت کا ایک مثالی ادارہ ہے۔ دس سال قبل جھارکھنڈ اکیڈمک کونسل سے اس کو میٹرک کے لیے منظوری ملی ہے۔ جھارکھنڈ کے علاوہ دوسرے صوبوں بہار اور بنگال وغیرہ کی تقریباً ۶۰۰/ طالبات دارالاقامہ میں قیام پذیر ہیں۔ اس کی کارکردگی اطمینان بخش ہے۔ خبر ہے کہ گذشتہ سالوں کی طرح امسال بھی اس کا میٹرک کا نتیجہ صد فیصد رہا۔ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے متعدد بار جامعہ کو سو فیصد رزلٹ کے لیے توصیفی سند بھی دی جا چکی ہے۔

(افکار ملی، جولائی ۲۰۱۷ء) ک،ص اصلاحی

## آثار علمیہ و تاریخیہ

# علم حدیث کے غیر مطبوعہ متون اور ان کی اشاعت

مولانا سید سلیمان ندویؒ

''زیر نظر مضمون مولانا سید سلیمان ندویؒ کی گویا نایاب تحریر ہے، جو جولائی ۱۹۲۷ء میں دارالعلوم دیوبند سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی یادگار کے طور پر جاری ہونے والے رسالہ ''المحمود'' میں شائع ہوئی۔ اس کے مدیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تھے، جن کے لیے ادارت کی جگہ زیرِ سیادت لکھا گیا، مرتب مولانا محمد یحییٰ صدیقی تھانوی تھے۔ میرٹھ کے ''الخلیل'' پریس میں چھپ کر رسالہ کتب خانہ عثمانیہ دیوبند کے پتے سے شائع ہوا۔ پہلی جلد کے پہلے شمارے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اس مضمون پر مدیر نے اپنے اور کارکنان ادارہ کے شکر گزار اور مزید کے امیدوار ہونے کا اظہار کیا اور سید صاحب کی اس تجویز کو کہ حضرت شیخ الہند کی ایک یادگار بصورت ''کتب خانہ متون حدیث'' قائم کی جائے، نہایت مبارک و محمود قرار دیا۔ یہ مضمون اور رسالہ المحمود کے سرورق کا عکس بھوپال کے قدیم معارف نواز اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خانوادہ کے ایک وارث جناب احمد مصطفیٰ صدیقی مدظلہ نے معارف کے صفحات ''آثار علمیہ و تاریخیہ'' کے لیے پیش کیا۔ ان کی اس عنایت کے شکریہ کے ساتھ یہ مضمون نذر قارئین ہے۔ (معارف)

ہندوستان میں علم حدیث کی طرف سے ابتدائی صدیوں میں اس قدر بے اعتنائی برتی گئی تھی کہ وہ مدت تک تعلیم کے نصاب سے بھی خارج تھی، صرف ''مصابیح'' تبرک کے طور پر لوگوں کو پڑھائی جاتی رہی، بعد کو مشکوٰۃ المصابیح تک ترقی ہوئی، فرنگی محل کے درس نظامی میں فقہ واصول وکلام وفلسفہ و منطق کی بڑی بڑی کتابوں کے ساتھ حدیث میں صرف یہی مشکوٰۃ پر قناعت تھی۔ مولانا شاہ عبدالحق دہلوی عرب جا کر اس تحفہ کو ہندوستان لائے، تو حدیث کی کتابوں سے یہاں کے علماء کے کان بھی آشنا

ہوئے، یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی جو ہندوستان میں اس فن کے بانی وناشر تھے، خود انہوں نے اپنے زمانۂ تعلیم میں صرف مشکوٰۃ شمائل ترمذی اور کسی قدر صحیح بخاری پڑھی تھی، جیسا کہ خود انہوں نے اپنے رسالہ الجزءاللطیف میں لکھا ہے۔

مگر یہی وہ وجود گرامی ہے جس کی قسمت میں اس ملک میں حدیث نبویؐ کی تعلیم واشاعت کی خدمت مقدر تھی، اور بالآخران کے خاندان کی تدریس وتعلیم میں اللہ تعالیٰ نے وہ خیر وبرکت عطا کی کہ آج ہندوستان میں جہاں کہیں بھی درس حدیث کا سلسلہ ہے، ان بزرگوں کی نسبت تلمذ درس سے آزادی ناممکن ہے، یہاں تک کہ بلاد عرب میں بھی گذشتہ صدی سے اسی خاندان کے ایک فرد (مولانا شاہ عبدالغنیؒ) کے ذریعہ سے اس فن شریف نے ترقی ووسعت حاصل کی اور آج کوئی سلسلہ سند حضرت ممدوح کے واسطہ سے زیادہ بہتر اور اقرب مدینہ منورہ میں بھی موجود نہیں اور پھر ہندوستان میں اس خاندان کی ہجرت کے بعد انہیں کے تلامذہ نے اس فن کو وسعت عطا کی۔

مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری، مولانا نذیر حسین دہلوی کے ذریعہ سے یہ فیض عام ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کا مقدس بانی خود بھی اسی سرچشمہ سے سیراب ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسی دوسرے شاہ ولی اللہ کے ذریعہ یہ سعادت نصیب کی کہ نہ صرف حدیث کی ایک یا دو کتابیں بلکہ صحاح کی پوری چھ کتابیں نصاب تعلیم میں داخل ہوئیں اور اب یہ فیض یہاں تک پہنچا ہے کہ ملک کے ہر گوشہ میں جہاں کہیں کسی عربی مدرسہ کا وجود ہے۔ وہاں قال الرسول کا ترانہ بھی سامعہ نواز ہو رہا ہے۔

تعلیم سے ہٹ کر کتب حدیث کی طبع واشاعت میں بھی اسی خاندان کے منتسبین نے سبقت کی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تمام دنیائے اسلام میں یہی وہ سرزمین ہے جہاں سب سے پہلے حدیث نبویؐ کا کوئی صحیفہ چھپ کر منظر عام پر آیا۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ حدیث کی یہ کتابیں مختلف سنین اور مختلف مطبعوں اور مختلف علماء کی سعی ومحنت سے چھپ کر شائع ہوئیں۔ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری نے صحیح بخاری کی جس طرح خدمت کی، تصحیح کی، تحشیہ کیا، مکررات کے حوالے لکھے، نسخوں کا مقابلہ کیا وہ اسلام پر ایک احسان ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کا بیان تھا کہ مولانا اس میں پورے بیس برس مصروف رہے، یہ بھی وہ کہتے تھے کہ حضرت استاذ کا بیان تھا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے معاوضہ میں ساٹھ ہزار کا نفع اس کتاب کی فروخت سے

عنایت کیا۔انہوں نے اس کتاب کی رجسٹری بھی کرائی تھی،مولانا کہتے تھے کہ حضرت کو اس کا سخت ملال تھا کہ انہوں نے اس کی رجسٹری کرا کر اس کارخیر کو کیوں محدود کردیا، اور آخر اپنی زندگی ہی میں اپنے حقوق سے دست بردار ہوگئے۔

موطاامام مالک مطبع احمدی دہلی میں پہلی بار چھپی، یہ مطبع ۱۲۶۶ھ میں دہلی میں قائم تھا۔

جامع ترمذی کی تصحیح و اشاعت کا فرض بھی مولانائے ممدوح ہی نے ادا فرمایا، ۱۲۶۵ھ۔ ۱۲۶۶ھ میں مطبع العلوم دہلی میں ان کی تصحیح وتحشیہ سے چھپی۔

سنن ابی داؤد، ریاض الدولہ محمد مرزا خان بہادر خلف الصدق فخر الدولہ حافظ مرزا جان خاں کے مطبع محمدی واقع محلہ چیلہ دہلی میں عبدالرزاق خان پانی پتی کے تحشیہ کے ساتھ ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوئی مگر مصر میں یہ کتاب اس سے دو سال پہلے ۱۲۸۰ھ میں نصر ہورینی کی تصحیح سے مطبعہ کستلیہ سے چھپ کر شائع ہوچکی تھی، اس لیے ابوداؤد کی طبع و اشاعت کی اولیت کا فخر مصر کو حاصل ہے، نیز مسند ابن حنبل کی اشاعت کا فخر بھی اسی کو حاصل ہے۔

صحیح مسلم کو مطبع نول کشور لکھنؤ نے شرح نووی کے ساتھ ۱۲۸۵ھ میں شائع کیا۔

سنن ابن ماجہ مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہی کی تصحیح وتحشیہ سے مطبع فاروقی میں چھپی۔

سنن نسائی مولوی وصی احمد صاحب سورتی شاگرد محدث سہارن پوری کے تحشیہ و تصحیح سے ۱۲۹۶ھ-۱۲۹۹ھ میں مطبع نظامی کانپور میں چھاپی گئی۔

موطا اور صحاح ستہ کے علاوہ متون حدیث کی چند دیگر کتابیں علمائے اہل حدیث کی محنت و کوشش و اہتمام اور تصحیح وتحشیہ سے شائع ہوئی ہیں اور اس بارہ میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم اور مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔ چنانچہ سنن دارمی کا نسخہ نواب صدیق حسن خاں عرب سے لائے تھے اور انہیں کی فرمائش سے ۱۲۹۳ھ میں نظامی کانپور میں چھاپا گیا۔ طبرانی کی معجم صغیر ۱۳۱۱ھ میں مولوی شمس الحق صاحب نے مطبع انصاری دہلی میں چھپوائی، سنن دارقطنی بھی انہیں کے تحشیہ سے اسی مطبع میں چھپی۔

متون احادیث کی اشاعت کا تیسرا مرکز حیدرآباد دکن ہے، جہاں دائرۃ المعارف کا وجود ہماری علمی امیدوں کا تنہا سہارا ہے۔ سب سے پہلے ۱۳۱۰ھ امام ابن جارود المتوفی کی المنتقی نہایت

صحت، اہتمام اور دوسری کتب حدیث کے حوالوں کے ساتھ مطبع فیض کریم میں چھپی۔

بعدازیں مسند ابوداؤد طیالسی ۱۳۲۱ھ میں اور مراسیل ابوداؤد سجستانی اور طحاوی کی بعض تصنیفات دائرۃ المعارف سے شائع ہوئیں اور پچھلے سالوں میں مستدرک حاکم مع ذہبی چھپ کر شائع ہوئی اور اب آج کل وہاں سے امام بیہقی کی سنن کبیر شائع ہورہی ہے اور امسال اس کی پہلی جلد نظر افروز ہوئی ہے۔

متون حدیث کی ان کثیر التعداد کتابوں کی اشاعت کا جو فخر ہندوستان کو حاصل ہوا ہے وہ ایک ایسی بات ہے جس کو مصر تک کے علماء تسلیم کرتے ہیں، دو سال ہوئے سید رشید رضا صاحب کا ایک مکتوب میرے نام آیا تھا، جس میں انہوں نے ہندوستان کی اس فضیلت واولیت کی کافی داد دی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت سے ہندوستان میں علم حدیث کی معرفت اور واقفیت کو بے حد فائدہ پہنچا، مصر اور عرب کو میں دیکھ چکا ہوں، ٹرکی اور افغانستان سے واقفیت ہے، اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج اس علم کے جس پایہ کے واقف کار اور ماہرین ہندوستان میں ہیں دوسرے ملکوں میں نہیں پائے جاتے۔

ضرورت ہے کہ متون حدیث کی دوسری کتابیں بھی جو ہنوز طبع نہیں ہوئی ہیں، ان کی طرف بھی توجہ کی جائے، مجھے ایک مدت سے ان متون کے محل محال و مظنّ مظان کی تلاش ہے۔ حرمین اور ہندوستان کے اکثر مشہور کتب خانے زیر نظر ہیں، مکہ معظّمہ کے کتب خانہ حرم میں متن حدیث کی کوئی غیر مطبوع کتاب نہیں، مدینہ منورہ میں ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق سنن کبیر بیہقی، دلائل النبوۃ بیہقی کے کامل نسخے جنگ عظیم میں قسطنطنیہ چلے گئے اور ان کے ناقص نسخے کتب خانۂ محمودیہ میں ہیں۔ کتب خانۂ سیدنا عثمانؓ میں سنن کبیر بیہقی اور معجم کبیر طبرانی کے ناقص نسخے ہیں۔

ہندوستان کے کتب خانوں میں حیدرآباد، پٹنہ، سہارن پور، دیوبند، بھوپال اور لکھنؤ کے کتب خانے دیکھے ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں مسند ابویعلی اور فردوس الاخبار دیلمی کے کامل نسخے اور مصنف ابن ابی شیبہ کی جلد اول موجود ہے۔ پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں مسند عبد بن حمید (یا عبدالحمید) اور فردوس دیلمی کے نسخے ہیں اور اسی عبد بن حمید کے نسخہ کی نقل خانقاہ پھلواری (پٹنہ) میں ہے۔ فرنگی محل میں مولانا عبدالحئی مرحوم کے کتب خانہ میں مصنف ابن ابی شیبہ کی دوسری جلد موجود ہے۔ مولوی ناصر حسین صاحب کے کتب خانہ میں دیلمی اور مصنف ابن ابی شیبہ کی آخری جلد ہے۔

مظاہر العلوم سہارنپور کے کتب خانہ میں سنن کبیر بیہقی کے اجزاء ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی غالباً ابن ابی شیبہ کا ایک حصہ ہے۔

مصنف عبدالرزاق کی کامل جلدیں نہیں ملتیں، ایک جلد دہلی کے ایک تاجر کے پاس ہے اور اسی کی نقلیں متعدد مقامات پر نظر سے گذری ہیں، مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی کا کتب خانہ جس میں اس فن کی نادر کتابیں تھیں، برباد ہو چکا ہے۔

اس وقت جہاں تک پتہ چل سکا ہے متون حدیث کا سب سے نادر مجموعہ سندھ میں گوٹھ پیر جھنڈا کی خانقاہ میں ہے، جنھوں نے عرب و ہند سے نوادر کتب کی فراہمی میں خاص جدو جہد کی ہے۔ خانقاہ مذکور کے موجودہ سجادہ نشین صاحب نے میری فرمائش پر احادیث و رجال کی قلمی کتابوں کی فہرست بھیجی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت موصوف کے کتب خانہ میں متن حدیث کی سات غیر مطبوع کتابیں موجود ہیں:

۱۔ صحیح ابن عوانہ، جلد اول۔ ۲۔ مسند عبد بن حمید۔ ۳۔ مسند بزار، جلد اول۔ ۴۔ مسند ابو یعلی، جلد دوم۔ ۵۔ سنن کبری کی دس جلدیں۔ ۶۔ مصنف ابن ابی شیبہ کی چار جلدیں۔ ۷۔ مصنف عبدالرزاق، جلد سوم و چہارم۔

سنا ہے کہ سمدھن ضلع فرخ آباد کے کتب خانہ میں مصنف عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ کے نسخے ہیں۔ تفصیل بالا سے معلوم ہوگا کہ اس وقت ہندوستان کے مختلف گوشوں میں حدیث کے حسب ذیل غیر مطبوعہ متون، کامل یا ناقص موجود ہیں:

| نام | مقام |
| --- | --- |
| ۱۔ مصنف عبدالرزاق | دہلی و سندھ و سمدھن۔ |
| ۲۔ مصنف ابن ابی شیبہ | فرنگی محل، دیوبند، حیدرآباد، کتب خانہ ناصر حسین، سندھ و سمدھن۔ |
| ۳۔ مسند عبد بن حمید | پٹنہ، حیدرآباد، پھلواری و سندھ |
| ۴۔ صحیح ابی عوانہ | سندھ |
| ۵۔ مسند ابو یعلی | سندو حیدرآباد |

۶۔مسند بزار سندھ۔

۷۔فردوس الاخبار دیلمی حیدر آباد، کتب خانہ ناصر حسین، پٹنہ۔

عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ کی ناقص نقلیں متعدد مقامات میں ہیں، مفتی صاحب بھوپال ان کی نقلیں حرمین سے لائے ہیں۔شیخ خلیل عرب ندوی واستاذ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کے پاس جہاں تک اس وقت یاد ہے سدھن کی نقلیں ہیں۔اسی کی نقلیں نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی کے پاس ہیں۔ ٹونک کے ایک مولوی صاحب جو قلمی کتابوں کی تجارت کرتے ہیں انہوں نے ان کی نقلیں متعدد مقامات پر پہنچائی ہیں۔چنانچہ گورکھپور میں مولوی سبحان اللہ خان کے کتب خانہ میں بھی دیکھی ہیں، مگر افسوس ہے کہ یہ تمام نئی نقلیں اس قدر غلط اور مسخ ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے، الفاظ کی تحریف اور غلطی ایک طرف فقروں کا حذف بھی موجود ہے۔سبب یہ ہے کہ جاہل کاتبوں نے نقل کی ہیں اور اصل سے ان کا مقابلہ نہیں کیا گیا ہے اور نہ کسی نے نقل کے بعد ان کی تصحیح کی ہے۔تاجر کتب صاحب پانچ سو روپے میں یہ نقلیں دوسرے کے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں، مگر ؎

کریمان را بدست اندر درم نیست

خداوندان نعمت را کرم نیست

اس لیے ضرورت ہے کہ کسی قومی کتب خانہ میں ان متون کو یکجا کیا جائے، جن کتابوں کی نقلیں ممکن ہو ان کو حاصل کیا جائے، جو معرض فروخت میں ہوں، ان کو خریدا جائے اور اہل علم ان کی تصحیح ومقابلہ کا فرض انجام دیں اور پھر ان کی طبع واشاعت کا سامان کیا جائے۔

یہ رسالہ (المحمود) جس مقدس ذات کی یاد میں جاری ہوتا ہے، ان کی زندگی کا تمام تر مشغلہ اسی فن شریف کی خدمت تھی اور خدا تعالیٰ نے ان کے اس فیض میں وہ برکت عطا فرمائی کہ اسلامی ایشیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں ان کے انوار قدس کی کچھ نہ کچھ کرنیں نہ پڑی ہوں، اس لیے اس تجویز سے بہتر کوئی یادگار ان کے لیے اس دنیا میں نہیں ہوسکتی۔

## معارف کی ڈاک

# بہار میں معارف

کاشانۂ اشب، سکٹا دیوراج،
پوسٹ بسوریا، وایا لوریا،
مغربی چمپارن، بہار

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

منسلک غزل دوبارہ بھیج رہا ہوں، تقریباً سال بھر پہلے میں نے یہ غزل بھیجی تھی۔ شاید گم ہوگئی ہے، اسی لیے شائع نہیں ہوسکی۔ پسند آجائے تو اسے شائع کر کے مزید مشکور کیجیے گا۔

بہار میں معارف کے کتنے خریدار ہیں؟ اور کس ضلع میں کتنے؟ مغربی چمپارن میں ناچیز کے توسط سے ۷ خریدار ہیں، مزید خریدار بنانے کے لیے کوشش جاری ہے۔

جناب ظریف الحسن صاحب سے بہار میں معارف کے خریداروں کی فہرست بھجوا دیجیے گا، جواب کے لیے رجسٹرڈ لفافہ حاضر ہے۔

حج کے لیے پوری رقم جمع کر دی ہے۔ لیکن گرتی ہوئی صحت کچھ اور پیغام دے رہی ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ رب العزت کسی طرح وہاں پہنچا دے کہ اس دیار مقدس کی زیارت کرلوں۔ کاش! وہیں کی سرزمین میں پیوند خاک ہوجاؤں۔

خمار اس کی بخت رسا اللہ اللہ
مدینہ پہنچ کر جو واپس نہ آئے

میں کن مشکل حالات سے گزر رہا ہوں؟ تفصیل سے مطلع کروں گا۔

والسلام

محتاج دعا

جناب وارث ریاضی

# ادبیات

## غزل

### جناب وارث ریاضی

خدا کے فضل و کرم سے مجھ کو مزاج فکر و نظر ملا ہے
خرد کو دیوانگی ملی ہے ، جنوں کو ذوقِ ہنر ملا ہے

اسی کو کہتے ہیں لوگ دنیا ، یہی ہے شاید نظام عالم
کسی کے دل کو سکوں ملا ہے ، کسی کو دردِ جگر ملا ہے

یہ ہے مری بخت کی رسائی ؟ یا ہے فسوں تیری دل بری کا؟
جہاں جھکی ہے جبینِ الفت ، وہاں ترا سنگِ در ملا ہے

زہے یہ طرزِ وفا شعاری ، خوشا محبت کی پاس داری
نہ در پہ رہنے کی ہے اجازت نہ در سے اذنِ سفر ملا ہے

کسی کی جور و جفائے پیہم کی کیف آگیں نوازشوں سے
جو غم مجھے عشق میں ملا ہے ، وہ غم بڑا معتبر ملا ہے

یہ کیسا دعوائے آگہی ہے ؟ یہ کیسی تنقید کی ہے دنیا ؟
ہمارا ناقد اصولِ نقد و نگاہ سے بے خبر ملا ہے

حسین صورت ، حسیں نگاہیں ، حسیں تبسم ، حسیں ادائیں
حسین ہر اک شے ملی ہے ان کو ، مگر دلِ خودنگر ملا ہے

نہیں ہے کوئی مقام ایسا جہاں نہ پہنچا پیامِ عرفاں
زمینِ دنیا سے آسماں تک نشانِ وحی و خبر ملا ہے

تری اطاعت میں جی لگاؤں کہ لطفِ ذوقِ گنہہ اٹھاؤں ؟
کہ عرصۂ زندگی الٰہی ! مجھے بہت مختصر ملا ہے

نہ جانے کب سے بھٹک رہا ہوں نشاطِ منزل رسی میں وارثؔ؟
کہ بدنصیبی سے راہِ الفت میں دل مرا راہ بر ملا ہے

---

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار

# مطبوعات جدیدہ

**غالب اور غالبیات:** از پروفیسر عبدالحق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۰۰، قیمت ۳۰۰/ روپے، ناشر: اقبال اکیڈمی (ہند)، نئی دہلی، پتہ: ۲۳۱۵، ہڈسن لائن، کنگسوے کیمپ، دہلی۔

دیوان غالب کا ایک اہم مخطوطہ، غالب کے شعری اسالیب، ان کی پیامی شاعری، ان کے ہم معانی فارسی اردو اشعار، ان کا طرز استفہام یہ وہ عنوانات ہیں جو کتاب کے نصف نام کے ترجمان ہیں باقی غالبیات میں آزادی کے بعد تفہیم غالب، غالب کے ایک ممدوح معاصر شاہ غمگین گوالیاری، غالب شناسی اقبال، غالب و اقبال کے چند انگریزی تراجم اور غالب کے طرف دار اقبال کے عنوانوں سے مقالے ہیں، بطور ضمیمہ تین اور مضامین ہیں جو تین شخصی مرثیے، مومن کی شاعری اور اقبال اور قصائد ذوق کی تفہیم کا عنوان رکھتے ہیں۔ اردو تحقیق و تنقید کی دنیا غالب و اقبال سے اسی طرح زندہ و آباد ہے جس طرح شمس و قمر کے وجود سے یہ دنیا، ان کی رات دن کی گردش سے کیسے کیسے نظارے نگاہوں سے گزرتے رہے ہیں لیکن خیرہ کن تجلیاں بس خال خال ہیں۔ زیر نظر مجموعہ مضامین کو بڑے وثوق اور یقین سے ان ہی تجلیات میں رکھا جا سکتا ہے۔ اقبال سے محبت بلکہ عقیدت یا اقبال پر ایمان، فاضل جلیل مصنف کی سب سے بڑی شناخت ہے، ان کی ادبی زندگی کا سارا سرمایہ اور صحیح معنوں میں سرمایہ، اقبال ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس بیش قیمت سرمایہ کو عالمانہ انکسار "جتنا بن پڑا، نباہنے کی کوشش" جیسے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، ساتھ ہی یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ "غالب کا حق ادا نہ کر سکا" لیکن جب ان کے قلم سے مطالعہ غالب بتوسط اقبال اور تفہیم غالب جیسے مضامین آئے تو اہل نظر نے جس طرح ان کو بصیرت افروز اور اپنی نوعیت کی واحد و منفرد تحریر قرار دیا، حق یہ ہے کہ غالب کا حق ادا ہوگیا۔ غالب اور کلام غالب سے تعلق کی وجہیں لکھنے والوں کی طرح بے شمار ہیں، لیکن نگاہ حق کی نظر انتخاب کو کیا کہیے۔ ایک شعر نظر سے گزرا کہ

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اور بس اسی شعر نے قلم حق آ گاہ کے احوال بدل دیے۔ محقق و نقاد تو وہی جو صاحب دل بھی ہو جو صرف ایک شعر سے، اضطراب سے دو چار اس طرح ہو کہ پھر پورا کلام اپنے مطالعہ کے لیے مجبور کر دے، شاید ہی کسی ماہر غالبیات کو اظہار جذبات کے لیے یہ جملہ نصیب ہوا ہو کہ ''راز دہر کی کم تر جستجو سے باز آیا، کلام غالب پر توجہ ہوئی''۔ محقق ہو یا نقاد جب نظر اتنی پاک ہو تو مضامین کو نوائے سروش کہنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ یہ مقام اسی کو زیب ہے جو اپنے موضوع کے مقام بلند اور اس کی رفعتوں سے آشنا ہو، جو یہ جانتا ہو کہ ''غالب دوسروں کے اعتراف و انتقاد سے بے نیاز اپنے فن کے بذات خود قدر شناس ہیں، وہ شیوۂ جادو بیانی سے سرفراز اور نوع بہ نوع مضامین کی متاع بے بہا کے مالک ہیں، وہ عرب و عجم کے اسالیب سے آشنا ہیں۔ شہرت پروین کی پنہائیوں کو اپنی لذت پرواز سے پامال کرنے اور اپنے دیوان کو آئین سخن کی کتاب دین کہنے والے غالب ہیں''۔ ظاہر ہے ''ایسے فنکار پر لکھنا جاں گسل ہے اور پرخطر بھی''۔ اس کتاب کا ہر مضمون ثابت کرتا ہے کہ مصنف ایسے جاں گسل اور پرخطر مقامات سے کس خوبی و خوش اسلوبی اور واقعتہً سرخ روئی سے گزرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، خواہ وہ دیوان غالب کے ایک اہم مخطوطہ کا تعارف ہو یا پھر غالب فہمی کی دیگر تحریریں، غالب کی شخصیت اور فن حیرت افروز ہے، ان کے شعری اظہار کی کثرت آرائی، استعجابی ہو یا ان کی سخن وری، اعجاز و ساحری کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہو، ہمارے لیے اس سے زیادہ نہیں تو ٹھیک اسی طرح فاضل مصنف کی نظر، اسلوب اور سب سے بڑھ کر وہ روح ہے جس سے ہم کلام ہونے کی لذت فراواں سے قاری خود کو ادب عالیہ کی فردوس میں موجود پاتا ہے۔ لطف دوبالا تب ہوتا ہے جب غالب کی دنیا کی سیر کراتے ہوئے فاضل مصنف اقبال کے سایہ کو دراز کرتے جاتے ہیں۔ سرگوشی کرتے ہیں کہ اقبال کی رہبری غالب کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا، دونوں کو ایک نئی زبان، نیا آہنگ اور نیا شعری سانچہ ڈھالنا پڑا، جس میں لفظوں کے معانی میں وسعت کے ساتھ پگھلنے کی کیفیت عام ہے، یہ اقبال اور صرف اقبال ہیں جنھوں نے پہلی بار غالب کے فکری ارتفاع پر توجہ دلائی، جاوید نامہ میں نوائے غالب کے حوالہ سے بتایا گیا کہ اقبال کی نظر میں غالب کا مقام صرف شاعر یا فنکار کا نہیں بلکہ ایک فکر ساز اور نکتہ رس مرد قلندر کا ہے جس کی کارگہہ فکر میں قوموں کی تقدیر کے ماہ و انجم تخلیق پاتے ہیں۔ اس کے بعد اس سوال کے حق ہونے میں کیا شبہہ کہ کیا کسی ناقد کی نظر اس بازیافت کی متحمل ہو سکی؟ صحیح کہا گیا کہ تفہیم

غالب کے لیے ایک دانائے راز کی ضرورت ہے جو فلسفہ وفکر کے ساتھ شعر ونغمہ کا رمز شناس ہو اور تخلیق کے پر اسرار اعجاز کا امین بھی ہو۔ دانائے راز اب راز نہیں لیکن یہ جملہ خود اس کتاب اور صاحب کتاب پر بھی صادق آتا ہے۔

**گنج شائیگاں، کلیات قصائد :** از فلک شکوہ محمد علی مہکری آصف خانہ زاد، تحقیق و تقدیم ڈاکٹر راہی فدائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۴۲۸، قیمت ۴۸۵ روپے، پتہ: ڈاکٹر راہی فدائی، ۱۶۱۶ چوتھا کراس، شیوارامیا لے آؤٹ، کلیان نگر پوسٹ، بنگلور ۴۳، اور بنگلور وحیدر آباد کے مکتبے۔

ٹیپو سلطان شہید کا عہد اٹھارہویں صدی عیسوی کا ہے۔ ان کے قابل اعتماد رفیق اور متعدد اہم عہدوں پر فائز محمد علی مہکری ۱۷۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۲۴ء میں انتقال ہوا۔ یہی وہ دور ہے جب شمالی ہند کی زمین اردو شعر وسخن کی بلند پروازیاں نئے آسمانوں کی تلاش میں تھیں۔ لیکن کیا عجب معاملہ ہے کہ عین اسی زمانہ میں جنوب ہند کی اردو شاعری کی دنیا بھی بہترین شاعروں، قصیدہ نگاروں سے معمور تھی، حیدرآباد دکن تک تو نظر جاتی ہے لیکن آرکاٹ اور بنگلور جیسے مقامات جہاں شعر وسخن اور فکر و فن کی محفلیں پر رونق و پر شور تھیں، ان تک اردو کے مورخوں اور محققوں کی رسائی نہ ہو سکی، کیسے کیسے ہنرمند سخنور لکھنؤ و دلی سے دور اردو کی حکمرانی اس طرح قائم کر رہے تھے کہ دکن کا پورا علاقہ اردو محاوراتی زبان اور دکنی عوامی زبان کا سنگم بن گیا۔ شمال وجنوب کے اس اتحاد کا اثر تھا کہ شاعر پُرگو تو ہوتے ہی تھے، الفاظ پر قادر اور زبان کے مزاج داں بھی تھے۔ اسی لیے بہتوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میر ومرزا و سودا کی تقلید کی روش بھی عام تھی۔ اس کا ایک ثبوت زیر نظر کلیات قصائد ہے۔ حمد، نعت، منقبت کے یہ قصائد صرف شاعر ہی نہیں ٹیپو سلطان کی حکومت اور ان کے عوام کے مزاج کے بھی ترجمان ہیں۔

قریب سوا دوسو سال پہلے کرناٹک کی فضا میں ان اشعار نے خدا جانے کیا سماں پیدا کیا ہوگا کہ

چشم سے دیکھے تو کس پر لطف سے　　یک جہاں ہی سب ادھر ہو جائے گی
روشنی چہرہ کی کیا کہیے جبیں　　سر بسر جیسے قمر ہو جائے گی
صبح کا احوال کیا کہیے کسے　　شب ہی ساری شب قدر ہو جائے گی
جب زباں پر لاؤں حرف منقبت　　آب ریزی گہر ہو جائے گی

خواجۂ عالم بہاءالدین کی جب ترے اوپر نظر ہوجائے گی

تشبیب وگریز کا یہی منظر اکثر قصائد میں لطف دے جاتا ہے۔

تین ہزار سے زائد اشعار، مخطوطے کی شکل میں دارالعلوم لطیفیہ ویلور میں تھے۔ فاضل مرتب قادرالکلام شاعر ہیں، صاحب دواوین ہیں، نثر پر بھی یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس نادر مجموعہ کو جس سلیقہ سے مرتب کیا اور نہایت پراز معلومات عالمانہ مقدمہ سپرد قلم کیا، وہ جس طرح جنوب ہند کے قدیم علمی وادبی خزینوں کی دریافت اور تعارف کی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ قدر وتحسین کے لائق ہے۔ بعض نادر تحریروں کا عکس بھی ہے اور کرناٹک میں صاحب کلیات محمد علی مہکری اوران کے کئی بزرگوں کے مزاروں کی تصویریں بھی ہیں۔

**الشیخ العلامہ ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری، جھودہ الدعویۃ و آثارہ العلمیہ:** از مولانا عبدالخالق عبدالمبین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۵۷۶، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ سلفیہ بی ۱/۱۸ جی، جامعہ سلفیہ مارگ، ریوڑی تالاب، وارانسی، یوپی۔

بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں جن شخصیتوں نے اپنے علم وعمل بلکہ تجدیدی کارناموں سے ممتاز ونمایاں مقام حاصل کیا، ان میں مولانا ثناءاللہ امرتسری کا نام نامی بھی ہے۔ ان کی خدمات تھیں جن کی وجہ سے علامہ رشید رضا مصری نے ان کو ''الرحل الالٰھی فی الھند'' کے الفاظ سے یاد کیا۔ تفسیر سے مناظرہ تک اور اداروں اور جماعتوں کی بنا وقیام سے ان کو فعال و متحرک وجود بخشنے تک ان کی کاوشوں کا ایک سلسلہ زریں ہے۔ دیوبند، ندوہ، تحریک اہل حدیث سے ان کا تعلق ان کے علم اور قلب وذہن کی وسعت کا شاہد ہے تو مسیحیوں، آریہ سماجیوں، قادیانیوں سے ان کے مسلسل مناظرے ومباحثے ان کی ایمانی حمیت اور غیرت کا ثبوت ہیں۔ اسلام کے لیے ہمہ وقت سینہ سپر اور اشاعت ومدافعت کے لیے آمادہ وتیار، ایسی شخصیت کا مطالعہ آج کے دور میں زیادہ مفید و موثر ہے۔ کتابیں اور مضامین لکھے گئے لیکن جامعیت کی ضرورت بہرحال رہی، اس ضرورت کو فاضل مصنف نے غالباً زمانہ حصول علم ہی میں محسوس لیا تھا، ندوہ میں فضیلت کے مقالہ کے لیے انہوں نے حیات امرتسری کو موضوع بنایا، یہی مقالہ زیر نظر ضخیم کتاب کے وجود کی بنیاد بنا۔ انہوں نے مراجع و

مصادر کی تلاش و یافت میں جو مراحل سر کیے، ان کے جاننے والوں پر مخفی نہیں، ان کی محنت و کاوش بالآخر ایسی کتاب کی شکل میں سامنے آئی جو بے شبہہ کسی موسوعہ سے کم نہیں، عربی میں ہونے کی وجہ سے عالم عرب میں یہ ہندوستانی علماء کی ایسی تصویر بھی ہے جس سے اندازہ لگانا آسان ہوجاتا ہے کہ اسلام کی خدمت میں علمائے ہند کس مقام پر ہیں، اس کارنامہ پر فاضل مصنف پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کی جانب سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

**ناگپور میں اردو شاعری:** از ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۵۶، قیمت ۱۴۲/روپے، پتہ: ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸، مہاراشٹر۔

مہاراشٹر کے ودربھ علاقے کی خصوصیات میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی بھی ہے، بظاہر یہ علاقہ اردو خطہ نہیں، لیکن جب اسی خطے کے مرکزی شہر ناگپور کی بنیاد اٹھارہویں صدی کے اوائل میں رکھی جارہی تھی تو اس وقت وہاں عربی فارسی کے عالموں کی موجودگی دراصل آنے والے دنوں میں اردو کے امکانات کی بشارت تھی، تین صدیاں گزر گئیں اور اس بشارت کی تصدیق کرتی گئیں، اس کتاب کے فاضل مصنف کی زندگی ہی گویا اس داستان کے سنانے کے لیے وقف ہے، ان کے تحقیقی مقالہ کا موضوع ''ناگپور میں اردو'' تھا، بعد میں یہ سلسلہ دراز تر ہوتا گیا، اب تک ان کی چالیس سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن کا غالب حصہ ناگپور اور ودربھ کی اردو تاریخ ہی پر مشتمل ہے۔ زیر نظر کتاب بھی اسی کاوش کا جدید اظہار ہے جس میں پہلے مضمون میں ایک عام جائزہ ہے، جس میں یہ جملہ بڑا دلچسپ ہے کہ فی زمانہ یہاں شعراء کی اتنی بہتات ہے کہ ان کی شناخت ایک پریشان کن مسئلہ بن چکی ہے۔ بعد کے مضامین میں حمد و نعت، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، غزل، نظم، طنز و مزاح، رباعی، قطعہ اور بچوں کی شاعری پر الگ الگ گفتگو ہے، جس سے ناگپور کے شاعرانہ ماحول کے علاوہ ایک خاص مزاج سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے، جدید شعراء کے بارے میں لکھا گیا کہ گرچہ وہ نئے لفظ و معنی کے نظام کی تشکیل کرتے نظر آتے ہیں لیکن فکر و جذبہ میں وہ گہرائی اور لطف نہیں جو پہلے شعراء کے کلام کو رعنائی و زیبائی عطا کرتی تھی، تاہم فاضل مصنف کو یقین ہے کہ لائق اور مخلص شعراء کے سہارے ناگپور میں اردو روایت زندہ اور پائندہ رہے گی۔ ع ـ ص

# رسید کتب موصولہ

آخری شجر: رضوان احمد فاروقی، احساس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر فاؤنڈیشن ٹرسٹ، لکھنؤ۔

قیمت=/۲۰۰ روپے

آسان تاریخ ادب عربی: مولانا بدرالحسن الحافظ قاسمی، کتب خانہ حسینیہ، دیوبند۔

قیمت=/۲۰۰ روپے

تنقیدی زاویے: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔

قیمت=/۲۰۰ روپے

تیرہ ماسہ (شمالی ہند کا سب سے قدیم اور مکمل مخطوطہ): اکرم قطبیؔ، مرتبہ پروفیسر عبدالحق، نیشنل مشن فار مینسکرپٹس ۱۱۔ مان سنگھ روڈ، نئی دہلی۔

قیمت=/۵۰۰ روپے

حیات عمران (دوم): پروفیسر محمد حسان خاں، مکتبہ دین ودانش، ۱۳۔ مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال۔

قیمت=/۵۰۰ روپے

دھنک (شاعری): تبسم اعظمی، سینڈ پائپر پبلشرس، رائل شاپنگ سینٹر، امین آباد، لکھنؤ۔

قیمت=/۲۵۰ روپے

دیوان صفدر: صفدر حسین، رام پوری، مولانا محمد مظاہر اللہ خاں قادری وجیہی، جامع العلوم، فرقانیہ بازار مسٹن گنج، رامپور۔

قیمت=/۱۵۰ روپے

روایت اور انفرادی صلاحیت: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔

قیمت=/۸۰ روپے

قاموس النحو: عزیز الرحمٰن الندوی، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، سہارن پور (یوپی)۔

قیمت=/۲۵۰ روپے

قرآن فہمی کے رہنما اصول: ڈاکٹر کمال اللہ بختیاری ندوی، ندوی بک ڈپو، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

قیمت=/۱۰۰ روپے

# تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

| | | | |
|---|---|---|---|
| سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن) | 2000/- | موازنہ انیس ودبیر | 100/- |
| سیرۃ النبیؐ | | اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر | 100/- |
| (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) | 2200/- | سفرنامہ روم ومصر وشام | 200/- |
| علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی | | کلیات شبلی (اردو) | 220/- |
| مقدمہ سیرۃ النبیؐ | 30/- | کلیات شبلی (فارسی) | 45/- |
| الفاروق | 300/- | مقالات شبلی اول (مذہبی) | 100/- |
| الغزالی | 200/- | مرتبہ: سید سلیمان ندوی | |
| المامون | 175/- | مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃 | 70/- |
| سیرۃ النعمان | 300/- | مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃 | 80/- |
| سوانح مولانا روم | 80/- | مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃 | 200/- |
| شعر العجم اول | 150/- | مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃 | 150/- |
| شعر العجم دوم | 130/- | مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃 | 90/- |
| شعر العجم سوم | 125/- | مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃 | 100/- |
| شعر العجم چہارم | 150/- | مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) 〃 | 110/- |
| شعر العجم پنجم | 120/- | خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی | 80/- |
| الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی | 350/- | انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی | 45/- |
| (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی | | مکاتیب شبلی اول 〃 | 150/- |
| الکلام | 250/- | مکاتیب شبلی دوم 〃 | 190/- |
| علم الکلام | 200/- | شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 220/- |

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
August 2017 Vol - 200 (2)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

## تصانیف و مطبوعات شبلی صدی تقریبات

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن) | علامہ شبلی نعمانی | 2000/- |
| ۲۔ | شبلی کی آپ بیتی | ڈاکٹر خالد ندیم | 325/- |
| ۳۔ | دارالمصنّفین کے سو سال | کلیم صفات اصلاحی | 350/- |
| ۴۔ | شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات) | مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 220/- |
| ۵۔ | الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی | علامہ شبلی نعمانی<br>تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی | 350/- |
| ۶۔ | محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس | ڈاکٹر جاوید علی خاں | 230/- |
| ۷۔ | حیات شبلی (جدید) | علامہ سید سلیمان ندوی | 650/- |
| ۸۔ | مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں | اشتیاق احمد ظلی | 250/- |
| ۹۔ | حیات سعدی | تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی | 400/- |
| ۱۰۔ | شبلی شناسی کے اولین نقوش | مرتبہ: ظفر احمد صدیقی | 600/- |
| ۱۱۔ | شبلی ایک دبستان | آفتاب احمد صدیقی | 250/- |
| ۱۲۔ | متاع رفتگاں | شاہ معین الدین احمد ندوی | 200/- |
| ۱۳۔ | یہود اور قرآن مجید | مولانا ضیاء الدین اصلاحی | 150/- |
| ۱۴۔ | رسائل شبلی | علامہ شبلی نعمانی | 300/- |
| ۱۵۔ | اردو ترجمہ مکاتیب شبلی | ڈاکٹر خالد ندیم | 110/- |
| ۱۶۔ | تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی) | مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی | 300/- |
| ۱۷۔ | مراسلات شبلی | ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 150/- |
| ۱۸۔ | مطالعات شبلی | مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی | 550/- |